

سیّد عبدالحمید عدمؔ



شہرِ فرہاد



مسکین مظہر علی خان

اہلِ ادب باذوق احباب کے لیے تحفہ پڑھنیے اور دعاؤں میں یاد رکھیے

Misken Mazhar ali Khan

مجھے تراش کے رکھ لو کہ آنے والا وقت

خزف دکھا کے گُہر کی مثال پوچھے گا

فضا ابنِ فیضی✍️

عشق ہو رحم کے قابل مجھے منظور نہیں
شہرِ فرہاد میں ایسا کوئی دستور نہیں

عدم

سید عبد الحمید عدمؔ

ناشر :- انور عارف مالک مکتبہ ماحول کراچی

طابع :- اشرف پریس لاہور

دوسری بار فروری ۱۹۶۲ء

قیمت چار روپے

فہرست

آ تو جاتی ہے پر نہیں آتی

وہ نظر دل میں در نہیں آتی

ایسے نکھرے ہوئے ہیں وہ دل میں

جیسے تصویر اُتر نہیں آتی

بعض راتوں کے بعد کہتے ہیں

اتفاقاً سحر نہیں آتی

فرصتِ زیست کو تباہ نہ کر

موت بارِ دگر نہیں آتی

میرا احوال پوچھنے والے
میری صورت نظر نہیں آتی

آپ دو گام میرے ساتھ چلیں
تجھ کو رسمِ سفر نہیں آتی

آج یوں ہنس پڑے ہیں دیوانے
جس طرح آنکھ بھر نہیں آتی

اہلِ کشتی کی خیر ہو یارب
اب تو کشتی نظر نہیں آتی

یا تمہارا پتہ نہیں چلتا
یا ہماری خبر نہیں آتی

میکدہ ہے یہاں سکون سے بیٹھ
کوئی آفت اِدھر نہیں آتی

آئنے کو ترے وصال کے بعد
اپنی صورت نظر نہیں آتی

چاندنی رات کا مزاج نہ پوچھ
ہم غریبوں کے گھر نہیں آتی

اتنی عجلت سے کام مت لیجے
اتنی جلدی خبر نہیں آتی

نیند بھی موت بن گئی ہے عدمؔ
بے وفا رات بھر نہیں آتی

صاحبِ اقتدار بن جاؤ
ہم فقیروں کے یار بن جاؤ
میں پرستارِ رنگ بنتا ہوں
تم خدائے بہار بن جاؤ
اس سے اونچا مقام ناممکن
سایۂ رہ گزار بن جاؤ
پھول چُن چُن کے تھک گئے مالی
ٹہنیو! خار زار بن جاؤ

سال میں ایک دن تو آتا ہے
آج تو میگسار بن جاؤ

زندگی آگ کی حلاوت ہے
مسکرا کر چنار بن جاؤ

بے حسی کی چٹان ہے دُنیا
چشمۂ کوہسار بن جاؤ

اے عدم اب وطن کی قید بھی کیا؟
نکہتِ بے دیار بن جاؤ

ہمیں خواب میں مت بلایا کرو
کسی اور صورت میں آیا کرو
زمانے کے اطوار اچھے نہیں
شبوں کو چمن میں نہ جایا کرو
کوئی نیک مصروفیت بخش کر
بُرائی سے ہم کو بچایا کرو
خُدا تم کو توفیق دے دوستو
مرے حال پر مُسکرایا کرو

کوئی تجربہ ہو اِک آزار ہے

کوئی بات ہو بھول جایا کرو

کبھی اپنی مرضی سے بھی مہ وشو

فقیروں کے نزدیک آیا کرو

جوانی کا موسم بڑا گرم ہے

گلستاں پہ تھوڑا سا سایا کرو

عدمؔ اتنی تکلیف اچھی نہیں

تکلّف سے کچھ باز آیا کرو

کس کا ارشاد ہونے والا ہے
عشق فرہاد ہونے والا ہے
ترکِ بادہ کا درس اے واعظ
یہ کہاں یاد ہونے والا ہے
اب تو کچھ لیجئے خبر دل کی
شہر برباد ہونے والا ہے
دل کی بستی پہ غور تو کیجئے
مُلک آباد ہونے والا ہے

اُس کی زلفیں جوان ہیں جب تک
کون آزاد ہونے والا ہے

جس جہاں کی عدم طلب ہے ہمیں
وہ تو ایجاد ہونے والا ہے

جوانی خوب صورت ہوگئی ہے
تری آنکھوں کی مورت ہوگئی ہے

محبّت اوّلاً ایک مصلحت تھی
مگر اب تو ضرورت ہوگئی ہے

مرے اخلاص کی سچّی عقیدت
وہاں جاکر کدورت ہوگئی ہے

قیامت پر یقیں سا آگیا ہے
ترے ملنے کی صورت ہوگئی ہے

عدمؔ بے دل لگائے کیا کمی تھی
یہ لغزش بے ضرورت ہوگئی ہے

کوئی قیمتی سی شے
چشمِ لطف، جامِ مے

بھا گئی ہے زیست کو
کوئی اجنبی سی شے

آرزو ہے دم بہ دم
جستجو ہے پے بہ پے

مر نہ جائے زندگی
کوئی جام، کوئی لے

پاس کھِل رہے ہیں گُل
دُور بج رہی ہے نَے

کوئی بات، کوئی رس
دل میں رنگ ہے نہ مے

دل ہے داغِ خوں عدمؔ
لطفِ دوستاں کی جے

مَے کی زندگی کا رس آرہی ہے پھر ہوس
اے سحابِ آرزو جُھوم جُھوم کر برس
اے جوان کونپلو اتنا رنگ، اتنا رس
خوں شراب بن گیا اے نگاہِ یار بس
اے جواں تیتری آج تو گلوں کو ڈس
پھر بہار آگئی ! شور ہے قفس قفس

اے عدمؔ دلِ جواں
جل گیا مثالِ خس

سوزِ محبّت ساز بنے گا
شبنم کی آواز بنے گا
حیرتِ گُل یا نوحۂ شبنم
کون مرا غمّاز بنے گا
یہ انجام یہ مدّت کا دکھ
کیا اب پھر آغاز بنے گا
دل کو شہرت کا چسکا ہے
یہ قصّہ کیا راز بنے گا

دم کے سوا تم آپ ہی سوچو
کون عدمؔ دم ساز بنے گا

ضروری ہے بہت، پر اندریں حالات کیا کیجے
وہ سنتے ہی نہیں جب بات تو پھر بات کیا کیجے
اگر اوقات کو پابند کر ڈالیں تو جینا کیا
اگر جینا ہے تو پابندیٔ اوقات کیا کیجے
ذرا زود آزما ہے بھروسہ ہم فقیروں کا
ذرا دیر آشنا سی ہے خدا کی ذات کیا کیجے
تھکاوٹ ہی نہیں محسوس کرتی گردشِ دوراں
گزرتے ہی چلے جاتے ہیں دن اور رات کیا کیجے
شکستِ توبہ روزانہ تو کچھ اچھی نہیں لگتی!
عدمؔ ہر روز اب ہوتی رہے برسات کیا کیجے

سلیقے ہیں جو برتے جائیں تو نایاب ہوتے ہیں
سُنا ہے بات کرنیکے بھی کچھ آداب ہوتے ہیں

خموشی قرض کے آہنگ سے بہتر ہے ہر صُورت
نہ جانے ساز کیوں شرمندہ مضراب ہوتے ہیں

وہ لمحے جن میں فکرِ عاقبت بینی نہیں ہوتا
وہ لمحے زندگی کے کسقدر شاداب ہوتے ہیں

میں ان کو دیکھتا رہتا ہوں سر تاپا نظر بن کر
وہ فرشِ گُل پہ جب خاموش محوِ خواب ہوتے ہیں

عدؔم انسان جب گہری نظر ڈالے حوادث پر
تو اُن میں بہتری کے بھی بہت اُسباب ہوتے ہیں

دشت باغ ہو گیا دل شفق میں کھو گیا

کون تھا جو آنکھ کو تیر سا چبھو گیا

کلفتوں کا سلسلہ مختصر سا ہو گیا

چلتے چلتے راہ رو راستے میں سو گیا

جس کا نام تھا یقین وہ گماں بھی لو گیا

فیضِ ہوش سے عدمؔ
میں نشے میں کھو گیا

صُبح مُرمریں نہیں شام احمریں نہیں
میرے عرضِ حال پر آپ کو یقیں نہیں
قطعِ ربطِ دوستی جانِ من نہیں نہیں
خار بھی ہے گُل مگر اس میں انگبیں نہیں
حُسنِ کائنات کیا؟ غمزۂ یقیں نہیں
کل جو دلفریب تھا آج کیوں حُسیں نہیں

کوئی آستاں عدمؔ
لائقِ جبیں نہیں

حیرت کدۂ عقل سے بیگانہ گزر جا

نادان نہ بن، صورتِ دیوانہ گزر جا

تا دیر ٹھہرنا نہیں اِس بزم میں اچھا

اِک لفظ میں کہہ کر یہاں افسانہ گزر جا

ہشیار، سلامت نہیں اِس راہ سے گزرے

اے دوست گزرنا ہے تو مستانہ گزر جا

جس راہ میں معشوق کھڑے ہوں ذرا تن کر

با تمکنت و نازِ حریفانہ گزر جا

کیا تجھ کو عدم سطوتِ شاہانہ کی حاجت

تو مردِ طریقت ہے فقیرانہ گزر جا

ضرر پہنچا ہے جی کو، دل گیا ہے
حسینوں سے بہت کچھ مِل گیا ہے
ہوئی ہو گی وہ شمعِ ناز روشن
پتنگا جانب محفِل گیا ہے
ترے پیہم تغافل کی ہوا سے
مرے ارماں کا غنچہ کھِل گیا ہے
کنارے سے چلی ہے کس کی کشتی
تلاطم کا کلیجہ ہل گیا ہے
عدؔم دِل اس طرح اَب مطمئِن ہے
کہ جیسے اس کو سب کچھ مِل گیا ہے

کیفِ طرب، یا کاہشِ غم، مستقبل میں کیا ہوگا
کون بتائے اے ہمدم، مستقبل میں کیا ہوگا

ساز کی نَے، غنچے کی چٹک، کاکلِ جاناں کا سایہ
آج تو ہے ہر چیز بہم، مستقبل میں کیا ہوگا

دخترِ زہرہ لہرا کر، آج ہی زلفیں بکھرا کر
چھم چھم چھم چھم چھم چھم چھم چھم، مستقبل میں کیا ہوگا

استفسار تو سادہ ہے، لیکن ہے کچھ مشکل سا
پھول سے کہتی ہے شبنم، مستقبل میں کیا ہوگا

آج ہی اتنی بے رنگی، یہ بھی بھلا کچھ بات ہوئی
حال یہ ہے تو جانِ عدمؔ مستقبل میں کیا ہوگا

نہ ہو نگاہ میں جب تک شعور کچھ بھی نہیں
گلوں کا رنگ ستاروں کا نور کچھ بھی نہیں

حضور کیا ہے؟ پریشان ہیں آپ جس کیلئے
حضور کچھ بھی نہیں ہے حضور کچھ بھی نہیں

بس ایک نیتِ پختہ کی شرط ہے لازم
یہ وہم فاصلۂ نزد و دُور کچھ بھی نہیں

چمک گئی تھی کبھی ایک خفیف سی بجلی
زیادہ اس سے تو رودادِ طُور کچھ بھی نہیں

تمہارے سر میں ذرا سا خلل یقینی ہے
مرے دماغ میں حضرت فتور کچھ بھی نہیں

قصور یہ ہے کہ کیوں سانس لے رہا ہے غریب
قصور کیا ہے؟ عدم کا قصور کچھ بھی نہیں

بڑی خیر و برکت ہے اس کام میں
ذرا رنگ بھر دے مرے جام میں
عجب حال ہے قلبِ مشتاق کا
نہ تکلیف میں ہے نہ آرام میں
یہ کس بخت والے کی سرکار ہے
ستارے جڑے ہیں در و بام میں
ذرا اپنی زُلفوں کو تکلیف دو
اُداسی بھری ہے مری شام میں
عدمؔ میرے شیشے سے ملتی ہوئی
یہ کیا چیز ہے دورِ ایام میں

جھوم کر وہ نظر جہاں مِلتی

دولتِ عمرِ جاوداں مِلتی

باغ سے وہ گئے تو پھر آئی

میکشوں کو خزاں کہاں مِلتی

عمرِ رفتہ کو یاد ہی نہ کیا

ورنہ ہمراہِ گُلرخاں مِلتی

عقل نے غم لگائے جی کو

ورنہ ہر عمر میں جواں مِلتی

دورِ شیشہ عدمؔ جو چل پڑتا

جوئے احساس کچھ رواں مِلتی

اب تیری گلی سے کیا لینا اب تیرے نگر کو چھوڑ دیا
اُس کوچہ و دَر سے لوٹ آئے اس شام و سحر کو چھوڑ دیا

ایسا بھی کبھی ہو جاتا ہے دو دُور فتادہ طبقوں میں
انساں نے خدا کو تیاگ دیا یزداں نے بشر کو چھوڑ دیا

آئے ہیں ہنر کے متوالے کس وقت زرِ خالص لے کر
جب اہلِ ہُنر نے تنگ آ کر تخلیقِ ہُنر کو چھوڑ دیا

انجامِ تجسّس کچھ اتنا دلچسپ، توجّہ کش نکلا
اربابِ محبت نے ملتی کر تحقیق و خبر کو چھوڑ دیا

تھی شرطِ عدم اُن آنکھوں کا نازک سا اشارہ ہونیکی
ہر وہم و گماں کو ترک کیا ہر خوف و خطر کو چھوڑ دیا

سبو بھی گلابی صبا بھی گلابی
افق بھی گلابی گھٹا بھی گلابی

تری زحمتِ اعتنا بھی شگفتہ
مری حسرتِ مُدعا بھی گلابی

بس اِک زُلف ہے جو ہے شبرنگ ورنہ
نظر بھی گلابی قبا بھی گلابی

سفینے میں دورِ سبُو چھیڑ دیجئے
کہ ہو جائے کچھ ناخدا بھی گلابی

بس اِک دیکھنے کا سلیقہ ہے سب کچھ
زمیں بھی گلابی، سما بھی گلابی
قدح خوار کی زندگی اللہ اللہ
فنا بھی گلابی، بقا بھی گلابی
عدمؔ کون کافر کرے فکرِ فردا
سفر بھی جواں، رہنما بھی گلابی

آپ کا نام ہے جہاں میں ہوں
کتنا آرام ہے جہاں میں ہوں

مسکرا کر اسیر کر لیجئے
حسرتِ دام ہے جہاں میں ہوں

سرمدی صُبح ہے جہاں تم ہو
دائمی شام ہے جہاں میں ہوں

آپ کِس کِس کا درد باٹیں گے
تشنگی عام ہے جہاں میں ہوں

گردشِ روزگار سے کہدو
گردشِ جام ہے جہاں میں ہوں

اے عدم پرتوِ نگاراں سے
وقت گُلفام ہے جہاں میں ہوں

زندگی کے اسیر پیتے ہیں
آبِ روشن ضمیر پیتے ہیں

ہم جوانوں پہ حرف گیری کیوں
محتسب! طفل و پیر پیتے ہیں

خونِ فرہاد کی دُہائی ہے
بے خرد جوئے شیر پیتے ہیں

آپ آقا ہیں آپ نُور پئیں
خونِ دل تو فقیر پیتے ہیں

پینا اُن طرفہ میکشوں کا عدمؔ
جو دمِ نوکِ تیر پیتے ہیں

محبّت تو نہیں معلوم کیا ہے
عقیدت آپ سے بے انتہا ہے
کوئی تکلیف تو سرکار کیجے
عداوت بھی محبّت میں روا ہے
ڈبو دے یا کنارے پر لگا دے
بس افراطِ خلوصِ ناخُدا ہے
تمہاری گفتگو ہے ہر کسی سے
نہ جانے یہ مجھے کیا ہو گیا ہے
ابھی سے اجنبیت بڑھ رہی ہے
ابھی تو دوستی کی ابتدا ہے
دُعا سے اے عدؔم جی بھر گیا ہے
یہ کیسی شکلِ تاثیرِ دُعا ہے

غیر رستے میں یار رستے میں
پیچ و خم ہیں ہزار رستے میں

فکرِ منزل کرو نہ اے یارو
منزلیں بے شمار رستے میں

ہم نے منزل پہ کیا پہنچنا تھا
مِل گئی تھی بہار رستے میں

رہزنوں کے مکان راہوں میں
رہبروں کے دیار رستے میں

کاروانِ خزاں سرِ منزل
کاروانِ بہار رستے میں

ہم عدمؔ راستے کی رونق ہیں
ہم کو رہنے دے یار رستے میں

بہار رنگ کے طوفاں لے کے آئے گی
حیات موت کے ساماں لے کے آئے گی

سُنا ہے ہم نے سرِ حشر رحمتِ یزداں
ترے خلوص کے پیماں لے کے آئے گی

تجھے اگر اس کی ضرورت پڑی مرے محبُوب
وفا کی شرط مری جاں لے کے آئے گی

دوبارہ دعوتِ جنّت جو دی ہے اب تُو نے
تو مصلحت کوئی انساں لے کے آئے گی

میں بھیجتا ہوں پھر اُس بزم میں تمنّا کو
گئی تو پھر کوئی روماں لے کے آئے گی

عدمؔ تم آپ نہ گر طُور پر گئے اِک دن
تو خلق چشمِ پشیماں لے کے آئے گی

زندگی رَم نہیں تو کیا ہوتی
زلف برہم نہیں تو کیا ہوتی

غنچہ و گُل کی تشنہ سامانی
مرگِ شبنم نہیں تو کیا ہوتی

زندگی کی بساط ہی کیا تھی
زندگی کم نہیں تو کیا ہوتی

ہنس پڑے تھے وہ دیکھکر مجھکو
آنکھ پُرنم نہیں تو کیا ہوتی

اے عدمؔ آرزو کی خوش فہمی
شادیٔ غم نہیں تو کیا ہوتی

مظالم اعتنا سے کم نہیں ہیں
حوادث رہنما سے کم نہیں ہیں

وہ زلفیں کس قدر بھی بے وفا ہوں
مگر آبِ بقا سے کم نہیں ہیں

میں ایسے دشمنوں کو ڈھونڈتا ہُوں
جو لطفِ آشنا سے کم نہیں ہیں

صبا جنّت سے بھی آئے تو جاناں
ترے گیسو صبا سے کم نہیں ہیں

وہ بیگانہ سہی ناہموار نظریں
نگاہِ آشنا سے کم نہیں ہیں

عدمؔ انسان کے بے لوث آنسو
فرشتوں کی دُعا سے کم نہیں ہیں

کہانی اس طرح تعمیر ہوگی
تری مرضی مری تقدیر ہوگی
قیامت آگئی کیوں اتنی جلدی
ترے آنے میں کچھ تاخیر ہوگی
مرے چاکِ گریباں پر نہ ہنسئے
کہ اس سے آپ کی تشہیر ہوگی
حرم اور دیر میں رکھا ہی کیا ہے
کہیں پتھر کہیں تصویر ہوگی
عدمؔ دل کی جگہ کیا اور ہوگا
بس اِک ٹوٹی سی نوکِ تیر ہوگی

دلِ رنجور کی یاد آرہی ہے
یہ کس مجبور کی یاد آرہی ہے

کسی کو مِصر کا غم کھا رہا ہے
کسی کو طُور کی یاد آرہی ہے

بہت نزدیک کوئی نغمہ زن ہے
نہایت دُور کی یاد آرہی ہے

دلِ تاریک روشن ہو رہا ہے
رُخِ پُرنور کی یاد آرہی ہے

یہ کیسا حُسن ہے دار و رسن میں
عدمؔ منصور کی یاد آرہی ہے

کچھ اس تیزی سے خنجر چل رہے ہیں
غمِ دوراں پہ خنجر چل رہے ہیں
روانہ ہیں ہم ایسے سوئے محشر
کہ جیسے یار کے گھر چل رہے ہیں
قفس میں گر دُاب ٹھہرے تو ٹھہرے
محافظ ہم تو باہر چل رہے ہیں
عدمؔ منزل کو جالیں گے اچانک
وہ رَہرو جو برابر چل رہے ہیں

فریب اچھا ہے پھر اِک بار کھا کر دیکھ لیتا ہوں
محبّت کو مکرّر آزما کر دیکھ لیتا ہوں

اگر اربابِ دل گِرتے ہوؤں کو تھام لیتے ہیں
تو خیر اِک مرتبہ پھر لڑکھڑا کر دیکھ لیتا ہوں

اگر دیر و حرم میں ہے ذرا سا بھی ترا پرتَو
تو میں سجدے کی کچھ قیمت گھٹا کر دیکھ لیتا ہوں

مجھے تو زندگی میں کوئی کیفیت نہیں ملتی
تمہاری آنکھ پر ایمان لا کر دیکھ لیتا ہوں

غمِ دوراں سے بس اتنا تعلق ہے عدمؔ میرا
غمِ دوراں کی جانب مسکرا کر دیکھ لیتا ہوں

تری زلفوں کی تابانی فراواں ہوتی جاتی ہے
مری راتوں کی ظلمت آبِ حیواں ہوتی جاتی ہے

بگولے اڑ رہے ہیں شہرِ دل میں نامرادی کے
یہ کیسی جانفزا بستی بیاباں ہوتی جاتی ہے

سفینے نے بالآخر گھاٹ کی مٹی تو ہونا ہے
غنیمت ہے کہ کچھ تفریحِ طوفاں ہوتی جاتی ہے

جنوں سے شکوۂ جامہ دری کا اب محل کیسا
خرد بھی خیر سے چاکِ گریباں ہوتی جاتی ہے

لچک رکھی ہے کتنی اے عدمؔ فطرت نے اشیا میں
طبیعت خود بخود مانوسِ حرماں ہوتی جاتی ہے

فصلِ گُل آ گئی تو کیا ہوگا
پھر گھٹا چھاگئی تو کیا ہوگا

یہ بجا ہے جنوں غلط ہے مگر
عقل گھبرا گئی تو کیا ہوگا

آنکھ اٹھا تو رہے ہیں دیوانے
برق لہرا گئی تو کیا ہوگا

صُورتوں پر نگاہ کرتے ہو
کوئی تڑپا گئی تو کیا ہوگا

نیند آتی نہیں تو کیا ہے عدمؔ
اور نیند آگئی تو کیا ہوگا

با سلیقہ حکیم ہو تم لوگ
مہ جبینو! کریم ہو تم لوگ
شبنم و گل سلام کرتے ہیں
کتنے نرم اور حلیم ہو تم لوگ
جادۂ مستقیم اگر ہے کوئی
جادۂ مستقیم ہو تم لوگ!
ہم تو زندہ ہیں اس عقیدت سے
زندگی کی نسیم ہو تم لوگ
اے عدمؔ کو نوازنے والو
زندگی کے ندیم ہو تم لوگ

رنگ نقش و نگار کو دیں گے

ہم تسلّی بہار کو دیں گے

آپ کی معرفت سہی لیکن

جان پروردگار کو دیں گے

آپ خود خاکسار ہیں حضرت

آپ کیا خاکسار کو دیں گے

روشنی ہم فقیر ہی آخر

عالمِ اعتبار کو دیں گے

ہم کہ ٹھہرے ہی شہریارِ عدمؔ

لوگ کیا شہریار کو دیں گے

زخم اندازۂ کمال آیا
چاند غائب ہوا، ہلال آیا

کیا کہے اب کلیم سے کوئی
بات کو التوا میں ڈال آیا

جاں نکلنے لگی عقیدت سے
کس کی تعظیم کا سوال آیا

ایسے بکھری وہ زُلفِ آشفتہ
جیسے آرائشوں کو حال آیا

کچھ عدمؔ کا بھی لو پتہ جاکر
میکشو عہدِ برشگال آیا

سحر کی ہوا کس قدر جانفزا ہے
چمن کی ہر اِک شاخ محوِ دُعا ہے
مناجات کا وقت ہے اے پرندو
کہ اس وقت سب کچھ خدا سُن رہا ہے
صبا کی سنک ہی نہیں حمد پیرا
گُلوں کی مہک بھی نمازِ غنا ہے
کہیں طائرِ مَست ہے وَجد میں گُم
کہیں چشمۂ آب سر دُھن رہا ہے
ہر اِک روح پر ہے عدمؔ کیف طاری
ہر اِک رنگ میں ذِکرِ صلّے علےٰ ہے

بات جب اُن کی کان پڑتی ہے
چین آتا ہے جان پڑتی ہے

جس نظر میں بھی ہے مروّت کچھ
دیکھی بھالی گمان پڑتی ہے

میکدہ دو قدم پہ ہے لیکن
راہ میں سوچ تان پڑتی ہے

ان میں اور ہم میں فاصلہ ہی کیا
زندگی درمیان پڑتی ہے

ایسے آتی ہے یاد اُس کی عدمؔ
جیسے بجلی سی آن پڑتی ہے

وہ جو تیرے فقیر ہوتے ہیں
آدمی بے نظیر ہوتے ہیں

پھول دامن میں چند رکھ لیجئے
راستے میں فقیر ہوتے ہیں

تیری محفل میں بیٹھنے والے
کتنے روشن ضمیر ہوتے ہیں

وہ پرندے جو آنکھ رکھتے ہیں
سب سے پہلے اسیر ہوتے ہیں

زندگی کے حسین ترکش میں
کتنے بے رحم تیر ہوتے ہیں

اے عدمؔ احتیاط لوگوں سے
لوگ منکر نکیر ہوتے ہیں

تُو بھی پردہ نشین ہے پیارے
حادثہ کیا حُسین ہے پیارے

اس میں خنجر کبھی نہیں ہوتا
یہ مری آستین ہے پیارے

موت ہوتی تو صبر کر لیتے
زندگی درکمین ہے پیارے

بات کو بار بار مت دُہرا
مجھ کو پورا یقین ہے پیارے

ہم اندھیروں کو کیوں توجہ دیں
تو ستارہ جبین ہے پیارے

اے عدمؔ سانس تیز تیز ہے کیوں
کون دل کے قرین ہے پیارے

دور میں آسمان ہے پیارے

کچھ ہمارا بھی دھیان ہے پیارے

میرے نقصان کا خیال نہ کر

زندگی اِک زیان ہے پیارے

کیا چمکتے فریب بکتے ہیں

کتنی اُجلی دُکان ہے پیارے

چھوڑ کر تجھ کو کس طرف جائیں

جان ہے تو جہان ہے پیارے

سوچ لے اب بھی کچھ نہیں بگڑا
وقت کچھ درمیان ہے پیارے
کون مرگِ حسیں پہ مرتا ہے
آرزو نوجوان ہے پیارے
بات کی آبرو نہ کھو بیٹھے
لڑکھڑاتی زبان ہے پیارے
معتدل رکھ زبان کا لہجہ
عاشقوں کی بھی آن ہے پیارے
ہم غریبوں کا کچھ نہیں اس میں
سب تری داستان ہے پیارے
میکدے پر نگاہ تو فرما
کیسا دارالامان ہے پیارے
زندگی تیر کیا چلائے گی ؟
اک شکستہ کمان ہے پیارے

اب تو کوئی بھی درمیان نہیں

کون اب درمیان ہے پیارے
زندگی کیا مسافروں کی عدم
ایک اڑتی سی تان ہے پیارے

نیند کو بد دُعا نہ دے جانا
گیسوؤں کی ہوا نہ دے جانا

کر رہے ہو علاج وحشتِ دِل
کوئی الٹی دوا نہ دے جانا

مجھ کو انسان کی ضرورت ہے
رحم کھا کر خدا نہ دے جانا

حشر میں کون کس کو مِلتا ہے
حشر کا آسرا نہ دے جانا

جی پڑے ہیں تمہارے کہنے پر
بندہ پرور دعا نہ دے جانا

میں عدمؔ ہوں مجھے خدا کیلئے
زندگی کی سزا نہ دے جانا

بے سہاروں کا آسرا ہے تو
مانا ہی پڑا خدا ہے تُو
آئینہ دیکھ کر بتا مجھ کو
کس کے وجدان کی خطا ہے تُو
دے اجازت کہ تجھ کو فاش کروں
لوگ کہتے ہیں لاپتا ہے تُو
لے اٹھا جام اور مگن ہو جا
کس توہم میں مبتلا ہے تُو

تیری بیداد کی شکایت کیا
دِل سے نکلی ہوئی دُعا ہے تُو

تجھ سے کیا ربط کم کریں ہم لوگ
زندگی کا معاملہ ہے تُو

گو مشیّت بھی تری اِک شئے ہے
لیکن اس سے بھی ماورا ہے تُو

کتنے اُلجھے ہوئے فقیر ہیں ہم
کتنا سُلجھا ہوا خُدا ہے تُو

باقی ہر چیز درمیاں کی کڑی
ابتدا تو ہے انتہا ہے تُو

ہائے کتنی محبّتوں میں عدمؔ
بے دریغی سے مُبتلا ہے تُو

ساز آواز، رنگ انگڑائی
پھر کسی مہ جبیں کی یاد آئی

صاف باتیں سُنائی دیتی ہیں
کس سے محوِ سخن ہے تنہائی

بند کردی زباں مشیّت نے
جینے والوں کو موت کب آئی

مدّعا دُور تک گیا لیکن
آرزو لوٹ کر نہیں آئی

عُمرِ رفتہ یہیں کہیں ہے عدمؔ
بج رہی ہے اُس کی شہنائی

آ ہماری پسند ہوتا جا

او حسیں سر بلند ہوتا جا

لوٹ لے دل کی دولتیں ہنس کر

حُسن وارجمند ہوتا جا

قدرِ آسودگی اگر ہے کچھ

بے نیازِ گزند ہوتا جا

ہم ترا انتخاب بنتے ہیں

تو ہماری پسند ہوتا جا

اے عدمؔ دام کتنے دلکش ہیں

یا صیدِ کمند ہوتا جا

دردِ دل اب تو عام ہوتا ہے
رات دِن صُبح و شام ہوتا ہے

میکدے کا معاملہ مَت پوچھ
ہائے کیا انتظام ہوتا ہے

جن کی قسمت میں پیچ ہوں اُن کو
تیری زلفوں سے کام ہوتا ہے

اُس کے ہاتھوں میں کیا نہیں ہوتا
جس کے ہاتھوں میں جام ہوتا ہے

اُس کی آنکھوں کا تذکرہ مت کر
خونِ صہبا و جام ہوتا ہے
پوچھئے مت جو ہم غریبوں کا
حال نزدیکِ شام ہوتا ہے
بعض اوقات زندگی کو عدمؔ
اُلجھنوں سے بھی کام ہوتا ہے

گرد دل کی آنسوؤں سے دُھولیا کرتے ہیں ہم
چُپکے چُپکے دل ہی دل میں رولیا کرتے ہیں ہم

جاگتے رہتے ہیں جب تک نیند آجاتی نہیں
نیند آجائے تو دو پل سولیا کرتے ہیں ہم

ہے خوشی بھی زندگی کا ایک جُزوِ لازمی
یہ خیال آتا ہے جب خوش ہولیا کرتے ہیں ہم

آرزو کی ہم کو مت ترغیب دے اے مہ جبیں
اِن حسیں راہوں میں خود کو کھولیا کرتے ہیں ہم

ہو غمِ جاناں کہ ہو اندوہِ دوراں اے عدمؔ
کیسے ہاتھوں ہاتھ ہر شے کو لیا کرتے ہیں ہم

جام میں آفتاب دَر آیا
آئنے میں شباب دَر آیا

دفعتاً واقعات جُھوم اُٹھے
ناگہاں انقلاب دَر آیا

دِل نے مشکل سے آنکھ کھولی تھی
پھر تمنّا کا خواب دَر آیا

میکدے جُھوم اُٹھے پیالوں میں
آج اتنا سحاب دَر آیا

پُھول مانگا تھا اُس کی زلفوں نے
خاندانِ گُلاب دَر آیا

حادثہ گاہِ بزمِ ہستی میں
تو عدمؔ کیا شتاب دَر آیا

ہم سے تم نے بھی کی تو نفرت کی
ہائے بد قسمتی محبّت کی

زندگی کھو کے یہ خیال آیا
زندگی چیز تھی ضرورت کی

وہ جب آئے ہجومِ محشر میں
رونقیں بڑھ گئیں قیامت کی

اے خدا تجھ کو ڈھونڈنے کے لئے
ہم نے پتھر کی بھی عبادت کی

قہر تھا آپ اگر کرم کرتے
شکر ہے آپ نے عداوت کی

تم نے ایمان کی قسم دی تھی
ہم نے ایمان کی حفاظت کی

شام کو دل اُڑا سا جاتا ہے
کیا گھڑی ہے نزولِ آفت کی

وہ ستم سے بھی دست کش ہیں عدمؔ
ہائے دریا دِلی مروّت کی

گلکدوں میں بھی حبال ہوتے ہیں
راستے سب محال ہوتے ہیں

آئینوں پر یقیں نہ فرمانا
آئنے سب خیال ہوتے ہیں

لیجئے یہ ادا بھی خوب رہی
حشر میں بھی سوال ہوتے ہیں

عارفانِ زوال ہی اکثر
صاحبانِ کمال ہوتے ہیں

جن کی ہم کو عدمؔ ضرورت ہے
وہ تو زہرہ جمال ہوتے ہیں

زخم کب کھل کے پھول ہوتے ہیں
قرض مشکل وصول ہوتے ہیں

آپ کی غفلتوں کا کیا شکوہ
اپنے اپنے اصول ہوتے ہیں

اک بہانہ ہے خود فریبی کا
کس کے سجدے قبول ہوتے ہیں

یوں بکھرتی ہیں وہ لٹیں جیسے
رحمتوں کے نزول ہوتے ہیں

دِل میں یوں بدگمانیاں ہیں عدمؔ
بَن میں جیسے ببُول ہوتے ہیں

جب نئی رسم و راہ ہوتی ہے
بدظنی گاہ گاہ ہوتی ہے

دیکھ لو ربطِ شمع و پروانہ
دوستی بے پناہ ہوتی ہے

میکدے سے ذرا پرے ہٹ کر
رات کتنی سیاہ ہوتی ہے

اور ہوتا ہی کیا ہے او ظالم
ایک ہی تو نگاہ ہوتی ہے

زندگی ایسے بجھ گئی ہے عدمؔ
جیسے اِک خانقاہ ہوتی ہے

یہ کیسی اعتبار آرائیاں ہیں
گلابی انتشار آرائیاں ہیں
یہ زخموں کے ہرا ہونے کی رُت ہے
جراحت کی بہار آرائیاں ہیں
محبت کی مہکتی خلوتوں میں
عقیدت کی نگار آرائیاں ہیں
ابھی تو فکرِ منزل خواب ہے اِک
ابھی تو رہ گزر آرائیاں ہیں
خِرد ہے اے عدؔم اور گنجِ حیرت
جنوں ہے اور دار آرائیاں ہیں

ہم اگر اعتبار کر لیتے

شعبدے کو بہار کر لیتے

دل کو اُن سے بڑی محبت تھی

اُن کو تھوڑا سا پیار کر لیتے

التجا تم نے سن تو لی ہوتی

ہم ذرا اختصار کر لیتے

جانے والے پلٹ بھی آتے ہیں

یار کچھ انتظار کر لیتے

دوست اگر دوستی کے اہل نہ تھے

دشمنی اختیار کر لیتے

بات کچھ ایسی بے تصنع تھی

آپ بھی اعتبار کر لیتے

ہم نے کچھ بھی کیا نہ یار عدمؔ

اپنے غم تو شمار کر لیتے

اے دلِ مضطرب اداس نہ ہو
زیست کو زہرِ غم ہی راس نہ ہو

کچھ نہیں زندگی کے دامن میں
کوئی مرہونِ التماس نہ ہو

نکہتِ گل کو کس نے دیکھا ہے
آپ کے گیسوؤں کی باس نہ ہو

ہم نے اک بات تم سے کرنی ہے
جب کوئی شخص آس پاس نہ ہو

اے عدمؔ خوش نہ ہو اگر کوئی
زندگی بھر کوئی اُداس نہ ہو

پھول جب کھل کے بے اساس ہوئے

میرے ارماں بہت اُداس ہوئے

عشق کی اِک خفیف سی ضد تھی

جس سے کونین اقتباس ہوئے

آج ہی دل کو موت آنی تھی

آج ہی تم نہ میرے پاس ہوئے

ہم کو جب شاعری کا شوق ہُوا

میکدے شعر کا لباس ہوئے

کتنے پختہ یقین تھے جو عدمؔ!

صرفِ خوش فہمئ قیاس ہوئے!

کیا مُسرّت سے لَو لگانی ہے

زندگی آنسوؤں کا پانی ہے

جو بھی کرنا ہے کر گزر اے دِل

سوچنا مرگِ شادمانی ہے

آج بھی ڈوبنے سے ڈرتا ہے

دیکھ دریا میں کتنا پانی ہے

اتنی کثرت سے اُگ رہا ہے گلاب

ساز کی لَے بھی ارغوانی ہے

ہم نے خود مُسکرا کے دیکھا ہے
مُسکرانا بھی نوحہ خوانی ہے
چاکِ دامن مرا رَفُو نہ کرو
یہ کسی دوست کی نشانی ہے
زندگی وہ جو اُن کے ساتھ گئی
یہ تو میری حیاتِ ثانی ہے
اُس کی انگڑائی میں عدم غلطاں
عالمِ قُدس کی جوانی ہے

دِل تری انکھڑیوں کا حامی ہے
کس قدر نوجوان خامی ہے

جس نے دیکھا ہے تیری زُلفوں کو
اُس کی آشفتگی دوامی ہے

آپ ہیں یا نسیم کا جھونکا
کون محوِ سُبک خرامی ہے

شیخ صرف آدمی نہیں ورنہ
آدمی تو بہت گرامی ہے

حُسن کا اِس میں کوئی دخل نہیں
عشق اک قدرتی غُلامی ہے

میکدے سے عدم ثبوت ملا
زندگی ایک تشنہ کامی ہے

صحرا صحرا مقام ہیں تیرے
دریا دریا خرام ہیں تیرے
ہم سمجھتے ہیں جن کو مے خانے
وہ تو خالی سے جام ہیں تیرے
ہم نے ہرجائی بن کے دیکھا ہے
ہر جگہ انتظام ہیں تیرے
بستیوں میں تلاش ہے تیری
جنگلوں میں قیام ہیں تیرے
جام میرے ہیں پیاس ہے تیری
پیاس میری ہے جام ہیں تیرے
زندگی ہو کہ گردشِ دوراں
سب علاج زیرِ دام ہیں تیرے

گماں تھا یار بت خانے میں ہوگا
چمن کا چاند پیمانے میں ہوگا
خرد کی پختگی کا کوئی پرتو!
کسی نادان فرزانے میں ہوگا
جسے دیر و حرم میں ڈھونڈتے ہو
وہ کم آمیز مے خانے میں ہوگا
عدمؔ کا بستیوں سے کیا تعلق
کسی شاداب ویرانے میں ہوگا

وہ فصلِ گُل میں جو گلشن کی آبرو ہوں گے
تمام غنچہ و گُل زخمیِ آرزو ہوں گے
بہشت میں نئی چیز ایسی اور کیا ہوگی
یہی نجوم، یہی گُل، یہی سبُو ہوں گے
ہجومِ حشر سے پہلے بھی ہم سے مِل لیجے
وہاں تو آپ بہر حال رو برُو ہوں گے
ہے سرخروئی خلوصِ سرشت پر مبنی
جو گُل سرشت نہیں کیسے سرخرو ہوں گے
ہم اُن کو ڈھونڈ کے محسوس کر رہے ہیں عدمؔ
جو اُن کو ڈھونڈیں گے بربادِ جستجو ہوں گے

صورتِ حال کیا حسیں نکلی
ان کے در سے مری جبیں نکلی

دامنِ گُل سے کچھ توقع تھی
وہ بھی گُل چیں کی آستیں نکلی

ایک ناوک کی اور بھی ہے کمی
دل کی حسرت ابھی نہیں نکلی

دِل کی بستی میں وہ بھی آبیٹھے
اُن کی اِملاک بھی یہیں نکلی

جس کو سمجھتے تھے ہم حیات عدمؔ
کیسی نادانئ یقیں نکلی

چشمے بہت ہیں، ساز بہت، گلستاں بہت
تفریح و سیر کے لئے کون و مکاں بہت
اِک حسنِ سرمدی نظر آتا ہے چار سو
ہوتا ہے ہم پہ جب وہ حسیں مہرباں بہت
گلشن میں حفظِ توبہ کی تلقیں نہ کیجئے
صبر آزما ہے خندۂ گُل کا سماں بہت
طرزِ نظر سے ملتی ہے کچھ مختلف خبر
یوں تو دکھائی دیتے ہیں وہ بدگماں بہت

اب موسمِ بہار کو آواز دیجئے

تاراج کر چکی ہے چمن کو خزاں بہت

محتاط ہو کے کیوں نہیں چلتے ستم ظریف

لٹتے ہیں رہگزار میں جب کارواں بہت

جس شاخ پر ہمارے نشیمن کی دھوم تھی

اب اُس پہ بن چکے ہیں عدمؔ آشیاں بہت

رہِ تلاش میں منزل کی آرزو نہ کرو
دیارِ موج میں ساحل کی آرزو نہ کرو
اِس انجمن میں نوا سنجیوں کی رسم نہیں
اس انجمن میں عنادل کی آرزو نہ کرو
حُصولِ گوہرِ مقصد کے بعد کیا ہوگا
بجا یہی ہے کہ حاصل کی آرزو نہ کرو
خراب کم تو نہیں دل کی آرزو نے کیا
نجات اسی میں ہے اب دل کی آرزو نہ کرو
عدمؔ جنوں میں اضافہ کرے نہ چاند کی ضَو!
کہا تو ہے مہِ کامل کی آرزو نہ کرو

آپ کا غم حضور ہے اس میں
دل کا اب کیا قصور ہے اس میں

دل کہیں لب بھگو کے آیا ہے
ہلکا ہلکا سرور ہے اس میں

ہم اگر عشق آپ سے کر لیں
کیا خرابی حضور ہے اس میں

دیکھ کر دل پہ ہاتھ رکھئے گا
آبگینہ سا چُور ہے اس میں

ہائے کیا چیز ہے عدم خواہش
ہائے کتنا سرور ہے اس میں

گو سراپا جفا رہے ہو تم
پھر بھی جانِ وفا رہے ہو تم

ہم کو اپنا سمجھ لیا تم نے
کتنے نا آشنا رہے ہو تم

ایک لمحہ تو ہنس کے بات کرو
ایک مدّت خفا رہے ہو تم

ایسی باتیں کبھی ہوئی بھی ہیں
کیسی باتیں سُنا رہے ہو تم

سرحدیں ختم ہیں محبت کی

میرے پہلو سے جا رہے ہو تم

مجھ میں کیا ایسی بات دیکھی ہے

مجھ پہ کیوں مُسکرا رہے ہو تم

اپنی آنکھوں کا احترام کرو

مجھ سے آنکھیں ملا رہے ہو تم

جھینپتے تو عدمؔ کچھ ایسے ہو

جیسے مسجد سے آ رہے ہو تم

آپ اور ہم حقیقتیں تو نہیں
کل کے بنتے ہوئے فسانے ہیں

آج کھل کر سحاب آیا ہے
دُور تک نصب شامیانے ہیں

ہائے اُس مہ جبیں کی آنکھ عدمؔ
جس کی تحویل میں زمانے ہیں

زیست آنکھیں ملا نہیں سکتی

موت بھی اب تو آ نہیں سکتی

ترک کر دو اُس آدمیت کو

جو خدا کو جگا نہیں سکتی

موت کا نام بھی ہے مجبوری

آنا چاہے تو آ نہیں سکتی

دل جب اپنی روش پہ چل نکلے

عقل کی پیش جا نہیں سکتی

زندگی مُسکرا تو دیتی ہے
زندگی مُسکرا نہیں سکتی

ضد وہ تعبیر ہے جوانی کی
جو تعیّن میں آ نہیں سکتی

بات اُسی وقت یاد آتی ہے
بات جب یاد آ نہیں سکتی

میں اُداس اس کو کر نہیں سکتا
مجھ کو دنیا ہنسا نہیں سکتی

ہم نے آواز دیکے دیکھا ہے
کوئی آواز آ نہیں سکتی

میں بھی وہ تلخ حادثہ ہوں عدمؔ
جس کو دنیا بھلا نہیں سکتی!

مرنے والے تری جوانی پر
کر گئے لُطف زندگانی پر

صُبحِ محشر بھی ہو گئی قُرباں
اس کی ڈھلتی ہوئی جوانی پر

کیوں کسی کی اُمید پر جینا
کیا بنانا مکان پانی پر

ہنس پڑی دو جہاں کی وحشت
اہلِ دانش کی نکتہ دانی پر

پھینک دے پھر کمندِ زُلفِ صنم
اے عدمؔ وقت کی روانی پر

جستجو مُدّعائے ہستی کی
بات ہے انتہائے مستی کی

کر دیا خوش خدا کو بھی ہم نے
اس عقیدت سے بُت پرستی کی

جب سے رخصت ہوا ہے غم دل سے
رونقیں مٹ گئی ہیں بستی کی

لے گئیں اُن دراز زلفوں تک
اُلجھنیں واقعاتِ ہستی کی

ہم فقیروں سے بھی عدؔم اکثر
زندگی نے دراز دستی کی

یوں نہ برباد کیجیے صاحب

کوئی ارشاد کیجیے صاحب

کون ہے التفات کا بھوکا

ستم ایجاد کیجیے صاحب

آپ نے بات کی تھی جو ہم سے

آپ ہی یاد کیجیے صاحب

ہلکی ہلکی سی یہ جراحت کیا

کھل کے برباد کیجیے صاحب

تا عدم شورِ حشر برپا ہو

ایسی بیداد کیجیے صاحب

تو بھی احوال آشنا نہ ملا
آنکھ اب ہم سے ساقیا نہ ملا
لوگ جینے کی بات کرتے تھے
ہم کو مرنے کا بھی مزا نہ ملا
آہ کتنی وسیع تھی دُنیا
ایک بھی یارِ آشنا نہ ملا
راستہ کٹ گیا سہولت سے
شکر ہے کوئی رہنما نہ ملا

وہ بڑے خوش نصیب انساں تھے

جن کی کشتی کو ناخدا نہ ملا

ہم پہنچ تو گئے تھے منزل پر

اتفاقاً ترا پتا نہ ملا

کٹ گئی جستجو میں عمر عدمؔ

دردِ ہستی کا مدعا نہ ملا

اُن سے گفت و شنید ہو جاتی
بدظنی کچھ مزید ہو جاتی
شکر ہے ذکرِ مُدّعا نہ چھیڑا
بھول کوئی جدید ہو جاتی
تم نے اچھا کیا نگاہ نہ کی
عادتِ بازدید ہو جاتی
حُسنِ ظن سے نہ کام اگر لیتے
بدگمانی شدید ہو جاتی
میکدہ بند ہے عدمؔ ورنہ
رات یومِ سعید ہو جاتی

اعتبارِ وفا نہیں کرتے
لوگ کوئی خطا نہیں کرتے

حشر کا کون اعتبار کرے
آپ وعدہ وفا نہیں کرتے

بات کرتے ہیں اہلِ دُنیا کی
آپ کا تو گلا نہیں کرتے

اب جفا کی بہت ضرورت تھی
اب وہ کوئی جفا نہیں کرتے

ہم تو بدنام ہیں عدمؔ یونہی
لوگ دُنیا میں کیا نہیں کرتے

رنجِ بے کیفیٔ حیات نہیں

آپ خوش ہیں تو کوئی بات نہیں

سوچئے تو ہزار باتیں ہیں

غور کیجیے تو کوئی بات نہیں

تذکرے ہیں خلوص کے جن میں

داستانیں ہیں، واقعات نہیں

فکر ہو جن کے ٹوٹ جانے کا

اُن سے ایسے تعلقات نہیں

ذکر ہے گردشِ زمانہ کا

آپ کی انکھڑیوں کی بات نہیں

کتنی شمعیں عدمؔ جلاؤ گے

زندگی گرمیوں کی رات نہیں

نظامِ گردشِ ایّام مشکل سے بدلتا ہے
چلے جب تک نہ دورِ جام مشکل سے بدلتا ہے

وہی بے ساختہ پن ہے محبّت کی صداقت کا
جو بن جائے رواجِ عام مشکل سے بدلتا ہے

نشے میں لب پہ آجاتی ہے اصلیّت جو ہو دِل کی
مزاجِ بادۂ گلفام مشکل سے بدلتا ہے

کسی بھی نام سے ہنس کر ہمیں آواز دے لیجے
مگر یہ یاد رکھیے نام مشکل سے بدلتا ہے

روش اپنی ہوا سے صبح بدلے تو بدل ڈالے
چلن اپنا سحابِ شام مشکل سے بدلتا ہے

خیالِ پختہ ہو تو اُس میں ہوتی ہے لچک کچھ کچھ
مگر یکسر خیالِ خام مشکل سے بدلتا ہے

محبت پر عدم بنیاد قائم ہے عناصر کی!
یہ ہے اسلام اور اسلام مشکل سے بدلتا ہے

حبابِ زندگی ہوں زندگی کی بات کرتا ہوں
نیا خورشید ہوں تابندگی کی بات کرتا ہوں

اجل کو اِس لئے پُر خاش ہے میرے تبسم سے
کہ موسم ہو نہ ہو میں زندگی کی بات کرتا ہوں

اُدھر وہ زُلف پھیلا کر صُراحی تھام لیتے ہیں
ادھر میں رات کی تابندگی کی بات کرتا ہوں

مری وہ روشنی جو کھو چکی ہے چاہِ ماضی میں
میں اس کی مستقل آئندگی کی بات کرتا ہوں

عدم کرنی ہو مجھ سے بات تو اُس حال میں کرنا
کہ میں پی کر بڑی پائندگی کی بات کرتا ہوں

خوشی کے جھومتے لمحات کا کیا نام ہے ساقی
جوانی کی کھنکتی رات کا کیا نام ہے ساقی
نشاطِ نوجوانی ہے کہ دینِ شادمانی ہے
میری نادانیٔ جذبات کا کیا نام ہے ساقی
ذرا آواز تو دینا اُسے زُلفوں کو لہرا کر
ترے قرباں اُس برسات کا کیا نام ہے ساقی
جنونِ کوششِ فرہاد ہے یا وحشتِ مجنوں
مرے اخلاص کی خدمات کا کیا نام ہے ساقی

اُدھر اُمڈے ہوئے بادل اِدھر ہنستے ہوئے شیشے
مگر اِس صورتِ حالات کا کیا نام ہے ساقی
نگاہوں کے تصادم سے وضاحت جسکی ہوتی ہے
دلوں کی اُس نہفتہ بات کا کیا نام ہے ساقی
ترے نکھرے ہوئے ماحول کو کچھ علم تو ہوگا
مرے اُلجھے ہوئے حالات کا کیا نام ہے ساقی
لقب تجویز کرنا ہے تری زلفِ مسلسل کا
سکوتِ شورشِ نغمات کا کیا نام ہے ساقی
یہ سُورج ہے یہ چاند اور اُسکے آگے ماند ہے دُنیا
مگر اُن عنبریں ظلمات کا کیا نام ہے ساقی
ملی ہے آگہی کچھ میکدے سے وہ بھی تھوڑی سی
تری آنکھوں کے ارشادات کا کیا نام ہے ساقی
عدمؔ کو صرف اُس کی ذات پر کامل بھروسہ ہے
خدا رکھے خدا کی ذات کا کیا نام ہے ساقی

گلوں سے دوستی ہے شبنمستانوں میں رہتا ہوں
بڑے سرسبز اور شاداب رومانوں میں رہتا ہوں
کنارے پہ نہ کیجے گا زیادہ جستجو میری
کہ میں لہروں کا متوالا ہوں طوفانوں میں رہتا ہوں
بہار اور برشگال آہنگ و شادابی کے موسم ہیں
بس ان دو موسموں ہی میں پری خانوں میں رہتا ہوں
مسرت کی تمنا ہو تو نادانوں سے ملتا ہوں
اذیت کی ضرورت ہو تو فرزانوں میں رہتا ہوں

وہ آنکھیں گرد میرے اس طرح مصروفِ گردش ہیں
کہ میں پیہم سُبک رفتار پیمانوں میں رہتا ہوں

میں دانستہ حقائق کی ڈگر کو چھوڑ آیا ہوں
میں تفریحاً طرب انگیز افسانوں میں رہتا ہوں

لب و ساغر سے زلفِ یار تک ہے سلطنت میری
گلستانوں میں سوتا ہوں شبستانوں میں رہتا ہوں

ہوس جن کو معطر کاکلوں کا نام دیتی ہے
محبت کے انھیں نکہت بیز کاشانوں میں رہتا ہوں

مجھے جھرنوں نے اکثر رقص میں مصروف دیکھا ہے
کہ میں دیہات کے سادہ غزل خوانوں میں رہتا ہوں

نہ جانے خلد میں کن سے عدم ہم مجلسی ہو گی
یہاں تو خیر کچھ باہوش انسانوں میں رہتا ہوں

صدا کس مہ جبیں کو گلستاں کی شام دیتی ہے
کہ نغمہ ریزہ خاموشی صدائے جام دیتی ہے

پہنچنا ہے کہاں تک کاروانِ رنگ و مستی کو
پتہ کچھ کچھ نگاہِ ساقیٔ گلفام دیتی ہے

تدارک میں بھی اب اس کا کوئی معقول سوچوں گا
بڑی تکلیف مجھ کو گردشِ ایام دیتی ہے

میں لے بیٹھا تھا اک دن مشورہ اربابِ دانش سے
مری دیوانگی اب تک مجھے دشنام دیتی ہے

جنھیں برباد ہونا تھا وہ پہلے کب سلامت تھے
یہ دُنیا بے سبب کیوں آپ کو الزام دیتی ہے

نظر بازی فزوں ہو کر کوئی صدمہ نہ پہنچائے
ابھی تو یہ طبیعت کو بڑا آرام دیتی ہے

غرض ہے جو کسی کی آس بر آنے نہیں دیتی
محبّت ہے جو سب کے کام سر انجام دیتی ہے

وہ دِلبر بنتے جاتے ہیں وہ جاناں بنتے جاتے ہیں
نگاہوں سے اترتے ہی رگِ جاں بنتے جاتے ہیں

بڑا دلچسپ ہے انساں کی کمزوری کا افسانہ !
جہاں یہ تھک کے رہ جاتا ہے یزداں بنتے جاتے ہیں

یہاں جو خوبصورت چیز ہے وہ سخت نازک ہے
مرے شیشے بھی تیرے عہد و پیماں بنتے جاتے ہیں

نہ جانے کیا خیال آیا ہے گلشن کے عناصر کو
بکھر کر آپ کی زُلفِ پریشاں بنتے جاتے ہیں

خرد کی آبیاری اس قدر زرخیز نکلی ہے
کہ دل نشو و نما پاکر بیاباں بنتے جاتے ہیں
اُدھر صرف ایک ہلکا سا تبسّم لب پہ آیا ہے
اِدھر رِستے گلستاں در گلستاں بنتے جاتے ہیں
کبھی ایسا تکلّف بھی ہوا ہے بزم امکاں میں
وہ گیسو چاندنی راتوں کا ارماں بنتے جاتے ہیں
اب اس سے بڑھ کے کیا تعظیم ممکن ہے سفینے کی
سفینہ جس طرف بڑھتا ہے طوفاں بنتے جاتے ہیں
عدمؔ جن کی فراست پر مدارِ زیست تھا اپنا
وہ یارانِ ستم دستور ناداں بنتے جاتے ہیں

ستارے بے خود و سرشار تھے کل شب جہاں میں تھا
اندھیرے روکشِ انوار تھے کل شب جہاں میں تھا
مسائل زندگی کے جو کبھی سیدھے نہ ہوتے تھے
سراسر سہل اور ہموار تھے کل شب جہاں میں تھا
اگرچہ محتسب بھی ان گنت تھے اس شبستاں میں
مگر سب میکشوں کے یار تھے کل شب جہاں میں تھا
جوانی محوِ آرائش تھی پوری خودنمائی سے
دو عالم آئنہ بردار تھے کل شب جہاں میں تھا

گدازِ قربتِ اصنام سے دل پگھلے جاتے تھے
نفس صہبا، بدن گلنار تھے کل شب جہاں میں تھا

گماں ہوتا تھا شاید زندگی پھولوں کا گجرا ہے
گلوں کے اس قدر انبار تھے کل شب جہاں میں تھا

طلب میں جن کی عمریں صرف کر دیں دیر و کعبہ میں
وہ مہ پیکر گلے کا ہار تھے کل شب جہاں میں تھا

جبینوں کی دمک، زلفوں کی ٹھنڈک، جسم کی خوشبو
غرض یہ ہے بڑے غمخوار تھے کل شب جہاں میں تھا

فرشتے تو فرشتے ہیں مشیت کے ارادے بھی
مری تعظیم کو تیار تھے کل شب جہاں میں تھا

عدم مت پوچھ کیا کیفیتیں تھیں ذہن پر طاری
نشاطِ روح کے معمار تھے کل شب جہاں میں تھا

اگر آغاز آزادِ غمِ انجام ہو جائے
فسانہ زندگی کا گیسوئے اصنام ہو جائے

مرے محبوب یہ دنیا بڑی دلچسپ دنیا ہے
یہاں اگر خدا بھی موردِ الزام ہو جائے

مری مستی سے تیری انکھڑیوں کی بات قائم ہے
اگر میں ہوش میں آجاؤں تو بدنام ہو جائے

تری چشمِ غزالیں میں اگر اک مرتبہ ڈوبے
شریعت رنگ بن جائے مشیّت جام ہو جائے

کوئی جام اس طرح چھلکے کہ موسم لہلہا اٹھے
کوئی زلف اس طرح بکھرے کہ گہری شام ہو جائے

عدم جب ہوش میں ہوتا ہوں یوں محسوس کرتا ہوں
وہ رہرو ہوں جسے جنگل میں گہری شام ہو جائے

لُطف کی بات ہونے والی تھی
آج برسات ہونے والی تھی

چاند ہی بدگماں رہے ورنہ
چاندنی رات ہونے والی تھی

اتفاقاً کچھ ایسی آشفتہ
شکلِ حالات ہونے والی تھی

زندگی کیا ہے خود مشیّت بھی
غرقِ ظلمات ہونے والی تھی

جو نظر وہ چرا گئے ہم سے
وہ خرابات ہونے والی تھی

ہائے کیا بات ہو سکی نہ عدمؔ
ہائے کیا بات ہونے والی تھی

کس لئے جملہ واقعات کہو
بیچ کی کوئی خاص بات کہو
لے گیا دل کو ایک حسیں رہزن
اب اسے دن کہو کہ رات کہو
یہ جو ہیں رکھ رکھاؤ ظاہر کے
ان کو رسمی تکلفات کہو
ہائے اے زندگی کے بیمار دو
کچھ تو اصلیتِ حیات کہو

بے رُخی کہہ دیا تو مذرت کیا

بے رُخی کو بھی التفات کہو

صُبح فردا کا ذکر لاحاصل

آج کیسے کٹے کی رات کہو

جس کی ہستی سے زندگی ہے جواں

اُس کو یارو عدم کی ذات کہو

ہر گلی میں یہی منادی ہے
وہ پری رُو ستم کا عادی ہے

حُسن کی کثرتِ تغافل نے
عشق کی زندگی بنادی ہے

بڑھ رہا تھا ادب سے پروانہ
شمع نے کیا حَسیں سزادی ہے

آج یہ کیا کیا ہے ساقی نے
بدمذاقوں کو بھی پلادی ہے

آگے انصاف اس کے ہاتھوں میں

ہم نے زنجیر تو ہلا دی ہے

لُطف آنے لگا ہے جینے میں

کس پری رُو نے بدُعا دی ہے

کی تھی مسمار ہم نے مر مر کر

اس نے دیوار پھر اٹھا دی ہے

اللہ! اللہ! خلوصِ ساقی کا

مَے میں کچھ زہر بھی ملا دی ہے

دیر و کعبہ سے دو قدم آگے

اور بھی اِک سکوں کی وادی ہے

پھر خرابات کے جھروکے سے

زندگی نے عدمؔ صدا دی ہے

چھلکتا ہی نہیں دل آنکھ جب تک نم نہیں ہوتی
وہاں غنچے نہیں کھِلتے جہاں شبنم نہیں ہوتی

اگر ہوتی ہے کچھ تو تری بے ترتیب زلفوں سے
بغیر اس کے کبھی آرائشِ عالم نہیں ہوتی

نہایت بیش قیمت آفتوں میں آپھنسا ہے دل
خدا راضی نہیں ہوتا خودی برہم نہیں ہوتی

ترنم میں بھی ہوتی تو ہے اک دلبستگی لیکن !
خموشی میں وہ موسیقی ہے جو بہم نہیں ہوتی

مسرت کا عدم احساس ہی ممکن نہیں جبتک
طبیعت آشنائے اہتزازِ غم نہیں ہوتی

محبت کی قیمت ادا کر رہے ہیں
وہ اربابِ دل کو دعا کر رہے ہیں
دعا سننے والا دعا سن رہا ہے
دعا کرنے والے دعا کر رہے ہیں
ہمیں مشورے کی ضرورت نہیں ہے
جو ہم کر رہے ہیں بجا کر رہے ہیں
صدا دیجئے گا خوشی کے دلوں کو
ہیں کس سوچ میں غرق کیا کر رہے ہیں
عدمؔ زندگی کو کہو آج اُسے ہم
خود اپنی خوشی سے رہا کر رہے ہیں

ستم کی اور بھی اک قیمتی تدبیر ہے ساقی
مروّت بھی فقیروں کیلئے شمشیر ہے ساقی

سُنا تھا زندگی اک غنچۂ نورستہ ہے لیکن
مجھے محسوس ہوتا ہے کہ نوکِ تیر ہے ساقی

اسی کہنہ یقیں پر ہے مدارِ دو جہاں قائم
خودی تدبیر ہے ساقی، خدا تقدیر ہے ساقی

میں جاہل ہوں مگر اس مدرسے کا طفلِ مکتب ہوں
جہاں صرف آدمیّت لائقِ توقیر ہے ساقی

سمجھنے والے اس حد تک تو اب تسلیم کرتے ہیں

مری مستی تری برہم شدہ تقدیر ہے ساقی!

پلا مے اور حقیقت دیکھ لے ارباب محفل کی!

کہ مے انسان کے اخلاق کی تفسیر ہے ساقی

مرے ماحول کو تبدیل کر دے اپنی آنکھوں سے

سنا ہے آدمی ماحول کی تعمیر ہے ساقی

سحر ہوتی ہے گل کھلتے ہیں چشمے لہلہاتے ہیں

عدم کی التجا سننے میں کیا تاخیر ہے ساقی

خود آگاہی کو اُستادِ طبیعت تو نہیں کہتے
محبّت کو مری سرکارِ وحشت تو نہیں کہتے

شعورِ آدمیّت آپ اِک اونچی ریاضت ہے
ریاضت کو شعورِ آدمیّت تو نہیں کہتے

سفینہ غرق ہے ملّاح نذرِ موجِ طوفاں ہے
مرے مولا اُسے طوفانِ رحمت تو نہیں کہتے

وہ آتے ہیں تو دل میں ایک خلش محسوس ہوتی ہے
میں ڈرتا ہوں کہیں اس کو محبّت تو نہیں کہتے

عدمؔ یہ ٹھیک ہے ہم پوجتے ہیں مہ جبینوں کو
مگر اس پوجنے کو ہم عبادت تو نہیں کہتے

تری چشمِ جواں اِک جادۂ انوار ہے ساقی
مری مستی شعورِ منزلِ دشوار ہے ساقی

میں مستی میں تفکّر سے زیادہ لُطف لیتا ہوں
کہ میری زندگی اِک عشرتِ افکار ہے ساقی

خُدا کے واسطے ڈال اک نِگاہِ کیف آلودہ
جنوں مجروح ہے ساقی خرد بیمار ہے ساقی

ہوائے موسمِ گل نے کچھ ایسا جنوں برتا ہے
کہ ہر غنچہ تبسم کیلئے تیار ہے ساقی

نہ خود سوتی ہے ظالم اور نہ اُنکو سونے دیتی ہے
گلوں پر کیا عتابِ شبنمِ بیدار ہے ساقی

یہاں کون ابنِ آدم کی مصیبت بانٹ سکتا ہے
یہاں ہر ابنِ آدم کا خدا غمخوار ہے ساقی

نگاہیں پھیر لیں تو نے تو اب اس کی تلافی کیوں
مجھے ہر خوبصورت حادثے سے پیار ہے ساقی

ذرا سی احتیاط اس چیز کی بھی دل میں رکھ لینا
طبیعت ہم فقیروں کی بڑی خوددار ہے ساقی

زمانے کے حوادث آشنا ہیں اس حقیقت سے
کہ میرا جام بھی اِک برہنہ تلوار ہے ساقی

عدمؔ کی پارسائی ہو کہ زاہد کی گنہ گاری
یہاں انساں وہی ہے جس کا کچھ کردار ہے ساقی

نین جام بن گئے
نیک کام بن گئے

زلف و رُخ کے ربط سے
صبح و شام بن گئے

خود ہی دل لُبھا لیا
خود ہی دام بن گئے

جن سے ربطِ خاص تھا
وہ بھی عام بن گئے

مے کے قحط سے عدمؔ!
زخم جام بن گئے!

رنگ خوب کھل گیا　　سب غبار دُھل گیا
میکدہ اُداس ہے　　میکشوں کا غُل گیا
گلستاں خموش ہے　　دورِ جام و مُل گیا
یوں گیا وہ مہ جبیں　　جیسے عہدِ گُل گیا

شب بخیر اے عدمؔ!
میکدہ تو کُھل گیا!

درد، لا دوا بھی ہے

حاملِ شفا بھی ہے

یونہی اتنی بڑھ گئی

میں نے کچھ کہا بھی ہے

آپ غور اگر کریں!

وہم کی دوا بھی ہے

عشق زندگی بھی ہے

عشق بد دُعا بھی ہے

عشق نامراد کا !
کوئی مدّعا بھی ہے
لُطفِ بے رُخی بھی ہے
جورِ اعتنا بھی ہے
ابتدا کی سادگی
صدقِ انتہا بھی ہے
کچھ مری خطا بھی ہے
کچھ تری رضا بھی ہے
اب بغیر دوستی
کوئی راستا بھی ہے
تو فقط صنم نہیں
جانِ من خدا بھی ہے
تیرے پائے ناز پر
بندگی روا بھی ہے

آدمی کو پوجنا

اذنِ کبریا بھی ہے

آ کہ میری روح میں

خلد کی ہوا بھی ہے

اس سکوت گاہ میں

محشرِ نوا بھی ہے

حُسنِ اتفاق سے

مے بھی ہے صبا بھی ہے

مرمریں کنول بھی ہیں

سرمگیں گھٹا بھی ہے

ربطِ ہستی و عدم!

کم بھی ہے سوا بھی ہے

لرزشِ رباب ہے
وادیٔ سحاب ہے
شام کے لباس میں
نخوتِ گلاب ہے
رنگ سے بھرا ہوا
جامِ ماہتاب ہے
عطر میں بسا ہوا
شہرِ آفتاب ہے

کس خلوص سے کھلا

میکدے کا باب ہے

کاسۂ شعور میں

دانشِ شراب ہے

بخت ہم خیال ہے

یار ہمرکاب ہے

ایک قیمتی خطا

حاصلِ ثواب ہے

رُوح کی شگفتگی

مذہبِ شباب ہے

کیا جلی حروف ہیں

کیا حسیں کتاب ہے

جام کے خطوط میں

سوچ کا شباب ہے

زندگی ہے اصلیت
فلسفۂ سُراب ہے
عشق ایک علم ہے
عقل ایک خواب ہے
تشنگی ہے زندگی
جستجو شراب ہے
تشنگی کے تول پر
میکدہ حباب ہے
بات کا جواب کیا
بات لاجواب ہے
یہ جہانِ آب و گل
عالمِ عتاب ہے
ہوشمند ہے وہی
جو یہاں خراب ہے

اور خراب اس طرح
جس طرح شراب ہے

تو کہاں چھپا ہوا
میرے ماہتاب ہے

آکہ میری زندگی
وقفِ اضطراب ہے

پھول ہیں کھلے ہوئے
موسمِ گلاب ہے

رنگ ہے چنا ہوا
وقتِ انتخاب ہے

دو دلوں کے میل سے
زندگی چناب ہے

رانجھا ایک گیت ہے
ہیر اِک رباب ہے

تیری میری دوستی

جوگیوں کا خواب ہے

تو عدم کے فکر کی !

سرمدی شراب ہے

اے حیاتِ افسردہ سیلِ رنگ و بو ہو جا

نکہتِ ختن بن جا ۔ رقصِ آبِ جو ہو جا

اے غزالِ آوارہ ۔ اے قرارِ صد پارہ

میری زندگی بن جا ۔ میری آرزو ہو جا

لب کشائی سے تجھ کو، ہے اگر تردّد کچھ

مد بھری نگاہوں سے، محوِ گفتگو ہو جا

اس سے قیمتی کیا اب، کوئی فلسفہ ہوگا

دانشِ صبا بن جا، حکمتِ سبو ہو جا

عشق آج نکلا ہے زحمتِ تماشا کو

اے نہایتِ خوبی اور خوب رُو ہو جا

ہستی و عدم میں اب فاصلہ ہی کتنا ہے

فاصلے کو کم کر دے میرے رُو برو ہو جا

ایک دن کا جینا ہے ایک دن کا مرنا ہے
شوق ساتھ لے جائیں کیا گناہ کرنا ہے
یا کوئی کہانی کہہ یا گزار دے ہنس کر
رات بھر فقط ہم کو اس جگہ ٹھہرنا ہے
پھوٹتا ہی آتا ہے حُسنِ زندگی ساقی
میکدے کا چشمہ بھی کیا عجیب جھرنا ہے
مرمریں سے ماتھے پر کیا شکن ہیں رنگین سے
حُسن کا بگڑنا بھی ۔ حُسن کا سنورنا ہے

بے سبب نہیں ساقی ہم کو عزم میخانہ
زرد زرد آنکھوں میں سُرخ رنگ بھرنا ہے
کثرتِ خرابی سے ہے عدم یہ اندیشہ
ایک دن ہمیں آخر زہر کھا کے مرنا ہے

آنکھ تری بدنام نہ ہو
یہ شے بھی دشنام نہ ہو
سیدھے سادے رستے میں
کوئی گہرا دام نہ ہو
ہم سے بھی اظہارِ کرم
ساقی اتنا عام نہ ہو
ساز سے باہر نغمہ ہے
ساز کے اندر جام نہ ہو

جس نے رستہ روک دیا

میخانے کی شام نہ ہو

مجھ سے اتنا تجاہل کیوں

تم کو مجھ سے کام نہ ہو

اتنا دل آویزہ نہ بن

اتنا خوش اندام نہ ہو

دل بے کل ہی اچھا ہے

مورکھ کو آرام نہ ہو

سوچتا ہوں دنیا میں عدمؔ

صرف خدا کا نام نہ ہو

نور بنے ہو نار بنے ہو

کیا کیا کچھ سرکار بنے ہو

کل تک تو بیزار تھے ہم سے

آج گلے کا ہار بنے ہو

جب کتنا آسان تھا ملنا

اب کتنے دشوار بنے ہو

روٹھ نہ جائے صبحِ قیامت

کیوں اتنے ہموار بنے ہو

اپنوں سے بھی اتنا تکلف

کتنے دنیا دار بنے ہو

صحتِ دوراں سجدہ فشاں ہے

کیا بانکے بیمار بنے ہو

کون عدمؔ وہ شاعرِ رسوا

کیا اب اس کے یار بنے ہو

وقت کی بے کیفی پہ نہ جاؤ

پھول بکھیرو، ساز اٹھاؤ

ہو جائے گا موم خدا بھی

پہلے روٹھے یار مناؤ

آئے ہیں دھن دولت والے

اے لوگو! دامن پھیلاؤ

چاہتے ہو بن مانگے سب کچھ

واہ رے اے مغرور گداؤ

گم ہو عدم کس سوچ میں ناحق

ہوش سنبھالو، جام اٹھاؤ

دل کو دل سے کام رہے گا
دو جانب آرام رہے گا

صبح کا تارا پوچھ رہا ہے
کب تک دورِ جام رہے گا

بدنامی سے کیوں ڈرتے ہو
باقی کس کا نام رہے گا

زلفوں کی ترتیب سلامت
عالم زیرِ دام رہے گا

ربط عدمؔ اس گل سے بڑھا لو
ہر موسم گلفام رہے گا

سانہ نہیں ہے جام نہیں ہے

رونقِ صبح و شام نہیں ہے

میخانہ ہے سُونا سُونا

ساقیٔ گل اندام نہیں ہے

اے دل والو کیوں ڈرتے ہو

گیسوئے جاناں دام نہیں ہے

دل کا تماشا دیکھ رہے ہیں

آپ سے کوئی کام نہیں ہے

یہ بھی عدم بیٹا ہے چمن کا

کانٹا کیوں گلفام نہیں ہے

اُن کا تغافل کام نہ آیا
پیاس نہ بھڑکی جام نہ آیا

دل کا تجسّس اب کیا کیجے
صبح کا بھولا شام نہ آیا

اُف ری محبّت کی بیماری
جان گئی آرام نہ آیا

دل میں تمہارا درد تو اُٹھا
لب پہ تمہارا نام نہ آیا

دل وہ عدمؔ کیا دِل ہے پیارے
جو یاروں کے کام نہ آیا

جوانیوں نے ہمارا نگر بسایا ہے
سیاہ رات کو انوار سے ملایا ہے
پڑھی ہیں ہم نے نمازیں کچھ اس عقیدت سے
کہ خود خدا بھی ہمیں دیکھنے کو آیا ہے
خزاں کل آئی تو کل دیکھا جائے گا ساقی
ابھی تو پھول کھلے ہیں سحاب چھایا ہے
کبھی کسی کو خیال آ ہی جائے گا
کہ ہم کو کھو کے کسی نے بھی کچھ گنوایا ہے

نہ جانے کتنے زمانوں کے انتظار کے بعد
تری نظر میں مروّت کا رنگ آیا ہے

کہو تو ہم بھی چلے جائیں بزمِ محشر میں
سُنا ہے ہم کو کسی شوخ نے بُلایا ہے

یہ زندگی کسی مہوش سے قرض مانگی تھی
یہ مال اپنا نہیں ہے عدمؔ پرایا ہے

مرے خلوص کا تھوڑا سا احترام کرو
ستم بھی ہو تو مجھی پر اُسے تمام کرو

طلوعِ صبح سے نازل ہے قہر کی گرمی
دراز گیسوؤں والو درودِ شام کرو

مسافروں کو یہ کہتا ہے راستوں کا جمال
یہیں تکان اتارو یہیں قیام کرو

مجھے غموں کی رعایات بخشنے والو
مری خوشی کا بھی تھوڑا سا انتظام کرو

غمِ حبیب کا کچھ چاہیئے علاج ضرور
غمِ زمانہ تو خیر اس کو غرقِ جام کرو
عدمؔ کی جاں پہ بنی ہے اگرچہ اُس کے بغیر
مگر تم اپنی نظر کو نہ اتنا عام کرو

اُسی فضا سے ہُوا ناگہاں گزر اپنا
حیات کاٹ رہی تھی جہاں سفر اپنا
سفینہ غرق ہوا بھی تو اب کہاں ہوگا
ہوا درست، خدا مہرباں بھنوؔر اپنا
کہیں تو صحنِ گلستاں میں برق گرنی ہے
سمجھ رہا ہوں ہر اِک آشیاں کو گھر اپنا
میں جانتا ہوں مشیت کی تنگ ظرفی کو
برت رہا ہوں میں اندازۂ نظر اپنا

کروں گا اے غمِ دوراں میں غور کچھ اس پر
بیاں تو کر تو مری جاں دردِ سر اپنا

بہت ہی جلد عدم ہم کو مل گئی منزل
بڑا طویل تھا اندازۂ سفر اپنا

مرا سُراغ کہ تیرا پتا طلوع ہوا

وہ دیکھ افق سے مری جان کیا طلوع ہوا

کُھلی وہ زلفِ مسلسل تو تب کہیں جا کر

ضمیرِ ماہ سے شہرِ صبا طلوع ہوا

اُٹھا کچھ اس طرح طوفان قعرِ دریا سے

کہ جیسے دیر سے اِک ناخُدا طلوع ہوا

ترے کرم سے مری زندگی کی شکل بنی

تری نظر سے مرا مُدّعا طلوع ہوا

محبت اس طرح جا گی عناصرِ دل میں
کہ جیسے دل میں شعورِ خدا طلوع ہوا
وہ گمرہی کے اندھیروں کی آخری حد تھی
جہاں سے ایک حسیں راستا طلوع ہوا
طلوع خیر ہوا تو ہے اک یقین عدم !
غلط طلوع ہوا یا بجا طلوع ہوا

وہ ایک بات جو مربوط ہے وہ بات تو ہے
ترے فسانے میں ترتیبِ واقعات تو ہے

یہ اور بات ہے گر جائے آدمیت سے !
وگرنہ آدمی تزئینِ کائنات تو ہے

تری ہی ذات ملائے گی ہم کو یزداں سے
خدا کی ذات نہیں ہے تو تیری ذات تو ہے

اگرچہ سیلِ حوادث میں بہہ رہے ہیں ہم !
خدا کا شکر تری چشمِ التفات تو ہے

تعلقات وہ کیسے بھی ہوں عدمؔ صاحب
تعلقات میں لطفِ تعلقات تو ہے

جونہی قریب دیارِ حبیب آتا ہے
سرور قلب و نظر کو عجیب آتا ہے

مرے مرض کے ازالے کی مکرمت کیجے
مجھے علاجِ دلِ بدنصیب آتا ہے

حیات کے اسی تپتے ہوئے بیاباں میں
مقام ایک عجیب و غریب آتا ہے

یہ بے سبب نہیں ہلچل ہوئی تلاطم میں
مرا خیال ہے ساحل قریب آتا ہے

عدمؔ ملول نہ ہو اس کی سرد مہری سے
اس امتحاں میں کوئی خوش نصیب آتا ہے

شراب ملتی ہے اور بے حساب ملتی ہے
بزورِ تشنگی کامیاب ملتی ہے

ہزار خواب حسیں جب تباہ ہو جائیں
تو پھر کہیں کوئی تعبیرِ خواب ملتی ہے

ہزار تشنہ اُمنگیں ہوں جب شکارِ اجل
تو ایک لرزشِ موجِ شراب ملتی ہے

سمٹ کے خونِ جگر جب نگاہ بن جائے
تو پھر کوئی نظرِ انتخاب ملتی ہے

طویل عمر میں ہر شخص کو بصورت شمع

بس ایک رات بہت کامیاب ملتی ہے

ملے اگر کبھی بھولے سے زندگی ساقی

تو کس خلوص سے خانہ خراب ملتی ہے

یہ کیا غضب ہے کہ شبنم کی ٹھنڈکوں میں بھی

حرارتِ نفسِ آفتاب ملتی ہے

دکھائی دور سے دیتے ہیں جانفزا چشمے

قریب جاؤ تو موجِ سراب ملتی ہے

نظر خرابِ حقیقت نہیں عدم ورنہ

کلی کلی کی بغل میں کتاب ملتی ہے

نظر کو جب ذرا توفیقِ کار ملتی ہے
رُخِ خزاں سے نویدِ بہار ملتی ہے

خرامِ آبِ رواں بھی ہے ایک چیز مگر
وہ تازگی جو صراحی سے یار ملتی ہے

جہاں سفر کا ارادہ ضعیف ہوتا ہے
وہیں سے ایک نئی رہ گزار ملتی ہے

وہ اک نظر جسے دل کا مزاج بنتا ہے
وہ دل سے کس طرح بیگانہ وار ملتی ہے

ابھی بجھی نہیں دُنیا عدم عقیدت کی!
ذرا سی روشنی اعتبار ملتی ہے!

شراب خانے میں تکلیفِ احتساب نہ کر
مری خوشی کو خدا کے لئے خراب نہ کر
یہ وقتِ شام یہ ٹھنڈی ہوا یہ ساحلِ جُو
ذرا سی پی مگر اس وقت اجتناب نہ کر
ترے لئے ہی تو جاری ہوا ہے دورِ سبُو
تو ماہتاب ہے توہینِ آفتاب نہ کر
شراب پی کے مجھے آنکھ کھول لینے دے!
ابھی چمکتے ہوئے رُخ کو بے نقاب نہ کر
ذرا فضا کا تقاضا تو دیکھ جانِ عدم
بہت حیا نہیں واجب، بہت حجاب نہ کر

خلوص آہ کا مفہوم کون سمجھے گا
دلِ تباہ کا مفہوم کون سمجھے گا

یہی تغافلِ پیہم ہے رسم و راہ اگر
تو رسم و راہ کا مفہوم کون سمجھے گا

تری نگاہ کا مفہوم اتنا گہرا ہے
تری نگاہ کا مفہوم کون سمجھے گا

ہے رہزنوں کی جبینوں پہ روشنی جبتک
دلیلِ راہ کا مفہوم کون سمجھے گا

ہیں چاندنی کا بسیرا دہ کاکلیں جب تک
شبِ سیاہ کا مفہوم کون سمجھے گا

عدمؔ کسی سے لپٹ جاؤ آج مستی میں
اس آہ۔ آہ کا مفہوم کون سمجھے گا

ہوائے رحمتِ دیر آشنا نہیں آئی
سبو تو ٹوٹ گیا ہے صدا نہیں آئی

غمِ زمانہ بھی مشاق ہے مظالم میں
مگر اُسے تری طرزِ جفا نہیں آئی

ملی تھی آپ کے ہمراہ جو جوانی میں
مرے نصیب میں پھر وہ ہوا نہیں آئی

پھر اُس طرح کی بہاریں نہیں ہوئیں خنداں
پھر اُس طرح کی نشیلی گھٹا نہیں آئی

اٹھا تو ہوگا کئی بار دستِ مجبُوری
سِتم ظریف کو لیکن دُعا نہیں آئی

عدم کہاں سے تواضع کے میکدے لاتے
خدا کا شکر کہ کالی گھٹا نہیں آئی

اُٹھا نقاب کہ موسم بڑا سہانا ہے

پِلا شراب کہ موسم بڑا سہانا ہے

چلو حضور کہ بادل گھرے ہیں ساون کے

اُٹھو جناب کہ موسم بڑا سہانا ہے

چلے شراب کہ نیت یہی ہے موسم کی

بجے رباب کہ موسم بڑا سہانا ہے

کسی کے ساتھ چمن میں سبو کشی کا خیال

ہے لاجواب کہ موسم بڑا سہانا ہے

نگاہِ یار رواں ہو مرے عناصر میں
برنگِ آب کہ موسم بڑا سہانا ہے
کوئی سخن کہ طبیعت عدم کی رقصاں ہو
کوئی خطاب کہ موسم بڑا سہانا ہے

یہ معجزہ بھی خریدار کرنے والے ہیں
تجھے نمائشِ بازار کرنے والے ہیں
ہماری توبہ سے اتنا تو فائدہ نہ اٹھا
تو جانتا ہے ہم انکار کرنے والے ہیں
جو بچ گئی تھی تری حفظِ آبرو کے لئے
وہ اِک خطا بھی ہم ایثار کرنے والے ہیں
یہ لوگ جو نظر آتے ہیں سیدھے سادے سے
یہ لوگ تو بڑی تکرار کرنے والے ہیں

یہ کاروبار جو کرتے ہیں صاحبانِ خرد

یہ کاروبار تو بیمار کرنے والے ہیں

ذرا ادائیں تو دیکھ ستم ظریفوں کی

یہ لوگ چارۂ آزار کرنے والے ہیں

ہمارے پاس بھی آ بے تکلفی سے کبھی

بڑے خلوص سے ہم پیار کرنے والے ہیں

ہر ایک درد کو درمان دینے والے ہیں

ہر ایک دشت کو گلزار کرنے والے ہیں

ستا لیا ہے بہت اُس کی رحمتوں کو عدمؔ

اب اپنے جرم کا اقرار کرنے والے ہیں

کچھ اس خلوص سے وہ بدگماں نگاہ ملی
کہ جیسے بھٹکے ہوئے قافلے کو راہ ملی

جہاں جہاں تری رعنائیوں کا چرچا تھا
وہیں وہیں مری بہکی ہوئی نگاہ ملی

گماں یہ تھا کہ کسی خط میں کچھ کمی ہوگی
وہاں تو خیر سے تعمیر ہی تباہ ملی

خیال میں بھی نہ سرزد ہوا گناہ کوئی
خیال تھا کہ بڑی فرصتِ گناہ ملی

بس ایک سجدے کا سارا بھرم تھا بعد اسکے
نہ نقش سجدہ ملا اور نہ سجدہ گاہ ملی
غمِ حیات کو کیا دورِ روزگار کو بھی!
ملی عدمؔ تو خرابات میں پناہ ملی!

جہاں جہاں سحر و شام تلخ گزرے ہیں
وہاں وہاں ترے اکرام تلخ گزرے ہیں

دیئے تھے ہم کو جو آرام تیری زلفوں نے
ترے بغیر وہ آرام تلخ گزرے ہیں

بس ایک روز تلافی ذرا سی ہو جائے
جنابِ من بہت ایام تلخ گزرے ہیں

تو بادشاہ سہی لیکن اے شہِ خود سر
فقیر پہ ترے احکام تلخ گزرے ہیں

طبیعت آج عدم اتنی غم گزیدہ تھی
کہ دورِ زمزمہ و جام تلخ گزرے ہیں

جہانِ ہوش میں جامِ شراب لایا ہوں
جہاں چراغ نہ تھا آفتاب لایا ہوں
سُنا تھا ٹوٹے ہوئے ساز خوب بجتے ہیں
بڑے خلوص سے دِل کا رُباب لایا ہوں
خلوص گو بڑی ارزاں سی چیز ہے لیکن
جو ہو سکا ہے مجھے دستیاب لایا ہوں
بناوٹوں کے کھلونے نہیں ملے مجھ کو
دلِ تباہ و نگاہ خراب لایا ہوں
تڑپ اٹھی ہیں عدم حکمتیں دو عالم کی
کہیں سے جب بھی ذرا سی شراب لایا ہوں

وہ فرشِ سبزہ پہ یوں نرم گام چلتا ہے
کہ جیسے چرخ پہ ماہِ تمام چلتا ہے
اِدھر تو گردشِ ایام کیسے آ نکلی
یہ میکدہ ہے یہاں دورِ جام چلتا ہے
ترے مذاق کے لمحے بسر نہیں ہوتے
اگرچہ وقت بہت تیز گام چلتا ہے
فریب دیجئے لیکن کسی سلیقے سے
دروغِ مصلحت آمیز عام چلتا ہے

نہ آنسوؤں کی کمی ہے نہ قحط آہوں کا
ترے کرم سے فقیروں کا کام چلتا ہے
پگھل ہی جائیں گے دِل اے عدمؔ حسینوں کے
کہ پتھروں پہ بھی سحرِ کلام چلتا ہے

فلک پہ رات کو جب ماہتاب ہوتا ہے

مرے سبُو سے رواں آفتاب ہوتا ہے

تمھاری شکل کو کوئی کس طرح پہچانے

تمھارے رُخ پہ ہمیشہ نقاب ہوتا ہے

یہ برگِ زرد، یہ کُہرا، یہ دھوپ کی کرنیں

خزاں کا روپ بھی کیا لاجواب ہوتا ہے

تم آنا چاہو تو مشکل نہیں کچھ آنے میں

زمانہ رات کو مصروفِ خواب ہوتا ہے

ہم اُن کے عشق میں ہیں اتنے غیر حال عدمؔ

کہ جس طرح کوئی غرقِ شراب ہوتا ہے

ہجومِ یاس سے جب ہم اُداس ہوتے ہیں
خیال ہے وہ کہیں آس پاس ہوتے ہیں
لباسِ رنگ نظر سے اتار دے اے دل
یہ شعبدے تو گلوں کا لباس ہوتے ہیں
تمہاری ہنستی ہوئی آنکھ کے رویّے پر
کئی طرح کے گمان و قیاس ہوتے ہیں
خبر نہیں یہ روایت ہے یا حقیقت ہے
سُنا تو ہے وہ رگِ جاں کے پاس ہوتے ہیں
نہ گرد جھاڑ عدمؔ میرے جیب و دامن کی
مسافروں کے بگولے ہی راس ہوتے ہیں

یہ بات سہل نہیں پر یہ بات ہوتی ہے

کبھی کبھی نظرِ التفات ہوتی ہے

سکونِ قلب و نظر سے ہماری کیا نسبت

کہ وہ تو تیری مروّت کی بات ہوتی ہے

بغیر گردشِ جام و بغیرِ نکہتِ زُلف

نہ صبح ہوتی ہے ساقی نہ رات ہوتی ہے

وہ اک خطائے جنوں دار ہے صلہ جس کا

وہی تو تربیتِ کائنات ہوتی ہے

وہاں سے راہ نما کا پتہ نہیں چلتا

جہاں عدم کے مسافر کو رات ہوتی ہے

ترے عتاب سے محروم ہو گیا ہوں میں
شرابِ ناب سے محروم ہو گیا ہوں میں

کبھی سوال کی بخشی نہیں گئی عزّت
کبھی جواب سے محروم ہو گیا ہوں میں

کچھ ایسی سمٹی ہے کاکل تری کہ تا بہ ابد
سکونِ خواب سے محروم ہو گیا ہوں میں

تو کیا فقیر سے ناراض ہو گئے ہیں جناب
تو کیا جناب سے محروم ہو گیا ہوں میں

بروزِ حشر بھی تیرے وقار کی خاطر
ترے خطاب سے محروم ہو گیا ہوں میں

ترے عتاب سے محروم ہو گیا ہوں میں
شرابِ ناب سے محروم ہو گیا ہوں میں

کبھی سوال کی بخشی نہیں گئی عزّت
کبھی جواب سے محروم ہو گیا ہوں میں

کچھ ایسی سمٹی ہے کاکل تری کہ تا بہ ابد
سکونِ خواب سے محروم ہو گیا ہوں میں

تو کیا فقیر سے ناراض ہو گئے ہیں جناب
تو کیا جناب سے محروم ہو گیا ہوں میں

بروزِ حشر بھی تیرے وقار کی خاطر
ترے خطاب سے محروم ہو گیا ہوں میں

غمِ زمانہ کو غرقِ شراب کر دوں گا

شبِ سیہ کو شبِ ماہتاب کر دوں گا

گماں نہ کر کہ مجھے جرأت سوال نہیں

نقطۂ ڈر ہے تجھے لاجواب کر دوں گا

مرے لئے تو خرابات ٹھیک ہے اے ہوش

تجھے بھی کوئی جگہ انتخاب کر دوں گا

میں بدنصیب ہوں مجھ کو نہ دو خوشی اتنی

کہ میں خوشی کو بھی لے کر خراب کر دوں گا

دماغ بادہ کشی تو نہیں عدم لیکن

کچھ احترامِ شبِ ماہتاب کر دوں گا

پیامات گرامی آگئے ہیں
گلستانوں پہ بادل چھا گئے ہیں
نظر ڈالی ہے جب بھی مہ وشوں نے
سُرورِ زندگی برسا گئے ہیں
محبت کرتے کرتے گلرخوں سے
محبّت کے سلیقے آگئے ہیں
میں اُن کی آرزو میں کھو گیا ہوں
وہ میری زندگی پہ چھا گئے ہیں
تسلّی دے کے وہ اک عارضی سی
عدم کتنا کرم فرما گئے ہیں

رباب وچنگ نہیں مطرب و شراب نہیں
کوئی بہانۂ تسکین و اضطراب نہیں
غمِ حیات کا مفہوم پوچھنے والے
یہ وہ سوال ہے جس کا کوئی جواب نہیں
نہ زہر دو ابھی ہم بیکسوں کو چارہ گرو!
ہمارا حال ابھی اس قدر خراب نہیں
اب اس کے بعد بھی ہے حشر کی کوئی صورت
ہمیں حجاب ہے لیکن تمہیں حجاب نہیں
ہے وقت خفتہ بہاروں کے جاگنے کا عدمؔ
وہ محوِ خواب ہیں لیکن وہ محوِ خواب نہیں

عجیب کیا ہے کوئی بات ہو گئی ہو گی
مُسافروں کو کہیں رات ہو گئی ہو گی

گیا تھا دل مگر اب تک نہیں ہوا واپس
کسی حسیں سے ملاقات ہو گئی ہو گی

ہجومِ حشر میں جب وہ ہمیں ملے ہوں گے
عجیب صورتِ حالات ہو گئی ہو گی

بکھر رہی تھی وہ زلفِ دراز تھم تھم کر
بکھر کے چشمۂ ظلمات ہو گئی ہو گی

شبِ الم کے تعاقب میں کون جائے عدمؔ
کہیں رہینِ خرابات ہو گئی ہو گی

نہ آس ہے نہ کوئی انتظار بیٹھے ہیں
تھکے ہوئے ہیں سرِ رہگزار بیٹھے ہیں

یہ وقتِ شام، یہ جنگل، یہ کنجِ تنہائی!
بڑا سکوں ہے بڑے برقرار بیٹھے ہیں

بہارِ آئینۂ دل سے اب نہ جائے گی!
کچھ اس طرح ترے نقش و نگار بیٹھے ہیں

سنو فسانۂ عہدِ بہار کانٹوں سے
یہ باخبر یہاں عمریں گزار بیٹھے ہیں

میں بزمِ حشر کو لے کر عدمؔ نہ اُڑ جاؤں
کہ میرے سامنے وہ شرمسار بیٹھے ہیں

اگرچہ صبحِ ازل بھی یہی اندھیرا تھا
تری جبیں سے نکلتا ہوا سویرا تھا

پہنچ سکا نہ میں بروقت اپنی منزل پر
کہ راستے میں مجھے رہبروں نے گھیرا تھا

تری نگاہ نے تھوڑی سی روشنی کر دی
وگرنہ عرصۂ کونین میں اندھیرا تھا

یہ کائنات اور اتنی شراب آلودہ
کسی نے اپنا خمارِ نظر بکھیرا تھا

ستارے کرتے ہیں اب اس گلی کے گرد طواف
جہاں عدمؔ مرے محبوب کا بسیرا تھا

تری نگاہ کو بیمار کس نے دیکھا ہے

خرامِ مستیٔ بیدار کس نے دیکھا ہے

وجودِ سایۂ دیوار ہے تڑپ میری

وجودِ سایۂ دیوار کس نے دیکھا ہے

ہمارے ہوتے ہوئے آپ کو لگاوٹ سے

ہمیں بتایئے سرکار کس نے دیکھا ہے

جہاں دلوں سے زیادہ عزیز ہو دولت

وہاں خلوصِ خریدار کس نے دیکھا ہے

روا ہے تہمتِ مستی مگر عدمؔ ہم کو!

خروش زن سرِ بازار کس نے دیکھا ہے

ترے شباب کو او گلعذار دیکھا ہے
لباسِ نشہ میں خوابِ بہار دیکھا ہے
تیرے نفس سے بھی چٹکا نہیں کوئی غنچہ
یہ حادثہ بھی نسیم بہار دیکھا ہے ؟
تری حسین پریشانیوں کی عمر دراز
ہمارا حال بھی اے زلفِ یار دیکھا ہے
کسی حسین کی آنکھوں کو اپنا ہوش نہ تھا
عجیب رقص سرِ رہ گزار دیکھا ہے

مری نظر کا مجھے کوئی اعتبار نہیں

تری نظر سے تجھے بار بار دیکھا ہے

ہوئی ہے جب بھی عدمؔ ان کو دیکھنے کی ہوس

بڑے خلوص سے بے اختیار دیکھا ہے

مزاجِ دل کا خلل آسنیں ہے جینے میں
میں ناخدا سے بہت تنگ ہوں سفینے میں

گری تھی بوند کہ میدانِ حشر جل اُٹھا
یہ کس کے دل کی تڑپ تھی ترے پسینے میں

جنوں کو سایۂ گیسو میں چین لینے دے
بس ایک رات کسی آتشیں مہینے میں

اِدھر ہی آتی ہے کونین کی حدِ آخر
عجب کشش ہے خرابات کے قرینے میں

ہم آفتاب پرستوں کو فصلِ گل میں عدمؔ
پلا شراب ستاروں کے آبگینے میں

کبھی کشادہ دلی سے جو یار ملتا ہے
نظر کو چین، جگر کو قرار ملتا ہے

کہیں تو کیسے کہیں اُس سے ماجرا دل کا
ملے بھی وہ تو سرِ رہگزار ملتا ہے

غمِ زمانہ کے بارے میں پوچھتے ہیں آپ؟
بڑے تپاک سے لیل و نہار ملتا ہے

کہیں کہیں تو خزاں کا قدم نہیں پہنچا
کہیں کہیں تو نشانِ بہار ملتا ہے

عدمؔ کمی نہیں دُنیا میں نعمتِ غم کی
ہمارا رزق ہمیں بے شمار ملتا ہے

سنا تھا لوگ بڑے دلنواز ہوتے ہیں
مگر نصیب کہاں کارساز ہوتے ہیں

سُنا ہے پیرِ مغاں سے یہ بارہا میں نے
چھلک پڑیں تو پیالے بھی ساز ہوتے ہیں

کسی کی زُلف سے وابستگی نہیں اچھی
یہ سلسلے دلِ ناداں دراز ہوتے ہیں

وہ آئینے کے برابر ہوں جب خدا بنکر
ادا و ناز سراپا نماز ہوتے ہیں

عدمؔ خلوص کے بندوں میں ایک خامی ہے
ستم ظریف بڑے جلد باز ہوتے ہیں

رباب و شاہد و مہتاب و جام رکھتا ہوں
خیال سلسلۂ صبح و شام رکھتا ہوں
مری نظر پہ ہیں فطرت کی خامیاں روشن
میں کائنات کو دل کا غلام رکھتا ہوں
ترے عتاب کی یہ ایک جدید صورت ہے
ترا خیال بصد احترام رکھتا ہوں
حیاتِ عارضی و دائمی میں فرق نہیں
حیات ہے تو حیاتِ دوام رکھتا ہوں
پرانے نام تو مجھ کو عدم پسند نہیں
میں کچھ جدید سے اشیا کے نام رکھتا ہوں

بات مہ پاروں کی کرنی چاہیئے
سیر گلزاروں کی کرنی چاہیئے

بندگی غیروں کی کچھ جچتی نہیں
بندگی یاروں کی کرنی چاہیئے

انتخابِ حادثہ سے پیشتر
جانچ معیاروں کی کرنی چاہیئے

کام اقراروں سے ہوتے ہیں خراب
مشق انکاروں کی کرنی چاہیئے

بات کہنی چاہیئے بجنتہ عدم
کاٹ تلواروں کی کرنی چاہیئے

کیا شگفتہ اور سہانی رات ہے

آج پی لو ارغوانی رات ہے

میں ازل ہوں آپ ابد اور بیچ میں

زندگی اک درمیانی رات ہے

آج خوفِ صبح مت فرمائیے

زندگی کی غیر فانی رات ہے

کاکلِ جاناں تسلّی ہو گئی

لوگ کہتے ہیں جوانی رات ہے

موت کہتی ہے جسے دنیا عدمؔ

نیند کی اک ناگہانی رات ہے

ٹوٹنا ان کا کہاں آسان ہے

آپ کے وعدوں میں میری جان ہے

اس کو تھوڑا سا اُجاگر کیجئے

میری ہستی آپ کی پہچان ہے

یا ابھی تخلیق میں خامی ہے کچھ

یا ابھی تعمیر میں انسان ہے

پالنا اس کو ہے تھوڑا سا ادق

قول دینا بڑا آسان ہے

زندگی ادراک کی کوشش نہیں
زندگی احساس کا ایمان ہے

عشق جس حد تک ہے عنوانِ خرد
عقل اُس حد تک بڑی نادان ہے

کیوں کھنچا جاتا ہے دل اُن کی طرف
جان ہے ان سے نہ کچھ پہچان ہے

زہر خند اور مئے کا شیشہ اے عدم
اب یہی تفریح کا سامان ہے

شمع پر گر جائیں دیوانے نہیں
بندہ پرور لوگ پروانے نہیں

ناشناسی کا یہ پہلا حُسن ہے
آج ہم اُن کو بھی پہچانے نہیں

مان لوں میں بات کیسے آپ کی
آپ میری بات تو مانے نہیں

آپ نے سمجھا کہ دیوانے ہیں ہم
باخُدا ہم لوگ دیوانے نہیں

ان حسیں لمحوں کا خون مت کیجیے

یہ حسیں لمحات پھر آتے نہیں

عقل کا رستہ تو کچھ معقول ہے

لیکن اس رستے میں میخانے نہیں

جب سے افسانہ بنے ہیں ہم عدمؔ

ہوش میں دنیا کے افسانے نہیں

زندگی اِک جشنِ طوفاں خیز ہے
وقت کی رفتار اب بھی تیز ہے
آؤ تھوڑی دور تک باہم چلیں
دُور تک موسم نشاط انگیز ہے
آج دیکھا ہے تمھیں ہنستے ہوئے
آج دنیا واقعی گُل ریز ہے
زندگی نوحہ سرا ثابت ہوئی
میں نے سمجھا تھا ترنم ریز ہے

ایک لمحہ تم سے ہم آغوش ہوں

آرزو کتنی تلاطم خیز ہے

دل میں رقصاں ہے محبت اے عدمؔ

آبگینہ رنگ سے لبریز ہے

میکشی ساتھ ان کے اور برسات میں
اتنی ہمواری کہاں حالات میں
چاندنی راتوں میں ڈھونڈا تھا جنہیں
وہ ملے ہم کو اندھیری رات میں
دل ابھی کھل کر نہیں باہم ملے
اجنبیت سی ہے احساسات میں
اُس حسیں کی کاکلوں میں ڈھل گئیں
جس قدر رعنائیاں تھی رات میں
ساغرِ مے کو ولی سمجھو عدمؔ !
کون ملتا ہے بُرے اوقات میں

خوش رہو اے ماہ پارو خوش رہو
زندگی ہنس کر گزارو خوش رہو

تم سے یہ امید تو ہرگز نہ تھی!
خیر اے نادان یارو خوش رہو

اور دنیا میں ہے کیا اس کے سوا
جانِ من گیسو سنوارو خوش رہو

ہم نہ بھولیں گے تمہاری صحبتیں
اے گدا پرور نگارو خوش رہو

خوش رہو اے ہنسنے والے ساحلو

اے تھرکتی جوئبارو خوش رہو

خوش رہو اے خوب صورت بدلیو !

اے پری پیکر خمارو خوش رہو

ناچنے والو ستارو ! السلام

جاگنے والی بہارو خوش رہو

تم نے بھی بخشی ہیں کافی ٹھنڈکیں

تم بھی اے جلتے چنارو خوش رہو

کلفتِ راہِ عدم سب مٹ گئی

باغِ ہستی کی بہارو خوش رہو

کس کی مدہوشی شریکِ ساز ہے
جو صدا ہے آپ کی آواز ہے

کر رہے ہیں گویا احسانِ عظیم،
ہائے کیا بیداد کا انداز ہے!

آپ اِک انگڑائی لے کر دیکھ لیں
موسمِ گُل مائلِ پرواز ہے!

دوستی میں غم بھی ہوتے ہیں بہت !
غور کر لیجے ابھی آغاز ہے

غنچہ و گل کی خموشی میں عدمؔ
کس حسیں بیمار کی آواز ہے!

اے دلِ ناشاد کیوں دلگیر ہے

زندگی ہنستا ہوا اک تیر ہے

میری حالت کا نہ غم فرمایئے

آپ کی کھینچی ہوئی تصویر ہے

اُس کی آنکھوں کا سہارا کون لے

میکشی رُسوائی کی تصویر ہے

اے عدمؔ چشمِ غزالاں کا سکوت!

اک شراب آلود سی تقریر ہے!

مدّعی کو ترجماں درکار ہے

دل کو آنکھوں کی زباں درکار ہے

زندگی کا میں نے کچھ دینا ہے قرض

مجھ کو مرگِ نوجواں درکار ہے

آپ کو بھی ہے طلب اک دوست کی

مجھ کو بھی اک رازداں درکار ہے

آپ دنیا کو نہ سب کچھ بانٹ دیں

ہم کو بھی کچھ مہرباں درکار ہے

ایک چبھتی سی نظر کی ہے طلب
ایک میٹھا سا زیاں درکار ہے
یہ سعادت پھر کہاں ہوگی نصیب
دوستوں کو میری جاں درکار ہے
آج دل اتنا پریشاں ہے عدمؔ
نکہتِ زلفِ بتاں درکار ہے

بادلوں کی گھن گرج برسات کی تصویر ہے

زندگی آشوب اور آفات کی تصویر ہے

آپ نے میری محبّت کو نہ پہچانا تو کیا

یہ بچاری مختلف اوقات کی تصویر ہے

مدّعا اُٹھتا ہوا طوفان ہے احساس کا

آرزو بنتی ہوئی برسات کی تصویر ہے

اُن دہکتے گیسوؤں سے یہ نہیں چلتا پتہ

صبح کا مفہوم ہے یا رات کی تصویر ہے

کس نے قطع گفتگو کی ہے کہ ہوتا ہے گماں
خاموشی ٹھہرے ہوئے نغمات کی تصویر ہے
جو زمانہ اس میں در آیا وہ اس کا ہو گیا
آبگینہ سرمدی لمحات کی تصویر ہے
میکدہ بھی موڑ ہے، اک زندگی کا اے عدمؔ
جام بھی اک گردشِ حالات کی تصویر ہے

روح پرور نام اور القاب یاد آنے لگے

جام و مینا مُطرب و مِضراب یاد آنے لگے

عنبریں زلفوں کے سائے احمریں ہونٹوں کے رس

زندگی کے قدرتی اسباب یاد آنے لگے

سانحاتِ خوشنما کی ٹیس اُٹھی جھوم کر

واقعاتِ دلکش و شاداب یاد آنے لگے

بھول جانے کی ہر اک سعیٔ جواں کے باوجود

بے مروّت، بے وفا احباب یاد آنے لگے

پھر رو پہلی ظلمتوں کے حلقۂ جاں بخش میں
اُجلے اُجلے مرمریں آداب یاد آنے لگے
پھر مسلسل گیسوؤں کے شبکدوں کی اوٹ میں
آفتاب آرائیوں کے خواب یاد آنے لگے
روح میں پھر اس طرح جاگا محبّت کا کنول
چاند یاد آنے لگے مہتاب یاد آنے لگے
جسم و جاں ہونے لگے محسوس لحنِ آب جُو
ہوش و دانش رنگ میں غرقاب یاد آنے لگے
گُل صفت اجسام کے حسّاس زیر و بم عدمؔ
صُورتِ موسیقیٔ اعصاب یاد آنے لگے